مارچ ۱۹۸۷ء

سہ ماہہ حکمتِ قرآن لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

حرفِ اوّل	عاکف سعید	۲
حکم و عبر (اسلام اور سیکولرزم)	ڈاکٹر ابصار احمد	۳
ہدایت القرآن (۱۳)	مولانا محمد تقی امینی	۱۵
دعوت رجوع الی القرآن (۳)	ڈاکٹر اسرار احمد	۲۱
منشورِ اسلام (۲)	ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم	۴۱
تبادلۂ خیال	ڈاکٹر محمد شیر بہادر خان پنی	۵۲
قرآن کالج (پراسپکٹس)	مرتبین: لطف الرحمٰن خان/عاکف سعید	۵۵

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

تصانیف ڈاکٹر اسرار احمد

	اعلیٰ	اشاعتِ عام
مُسلمانوں پر قرآنِ مجید کے حقوق	6.00	2.00
راہِ نجات (سورۃ العصر کی روشنی میں)	5.00	2.00
قرآنِ حکیم کی سُورتوں کا اجمالی تجزیہ	10.00	
مطالعۂ قرآنِ حکیم کا منتخب نصاب	12.00	
قرآن اور اہلِ عالم	2.00	
دعوت الی اللہ	2.00	
رسُولِ کامل ﷺ	6.00	
نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت	5.00	3.00
نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں	4.00	
معراج النبی ﷺ	3.00	
شہیدِ مظلوم (حضرت عثمان ذوالنورین رضؓ)	5.00	2.00
سانحۂ کربلا (شہادت حسینؓ کا اصل پس منظر)	4.00	2.00
اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کرنے کا اصل کام	2.00	
اسلام میں عورت کا مقام	8.00	5.00
عظمتِ صوم	2.00	
عیدالاضحیٰ اور فلسفہ قربانی	4.00	
اسلام اور پاکستان	5.00	
استحکامِ پاکستان	30.00 20.00	
علامہ اقبال اور ہم	3.00	
شادی بیاہ کے ضمن میں ایک اصلاحی تحریک	4.00	
اسلام کا معاشی نظام	6.00	
دعوتِ رجوع الی القرآن		

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

جاری کردہ: ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ۔ مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی

معاون مدیر: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

مینجنگ ایڈیٹر: اقتدار احمد

جلد ۶ | مارچ ۱۹۸۷ء مطابق رجب المرجب ۱۴۰۷ھ | شمارہ ۳

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور ۱۴۔ فون: ۸۵۲۶۱۱

کراچی آفس: ۱۱ داؤد منزل متصل شاہ بخری۔ شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زرِ تعاون ۴۰/- روپے فی شمارہ ۴/- روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

اللہ تعالیٰ کا شکر اور احسان ہے کہ 'حکمتِ قرآن' کی نومبر ۸۶ء کی اشاعت سے کہ جس میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے پرچے کی اشاعت میں باقاعدگی کے ضمن میں 'عزمِ جدید' کا اظہار فرمایا تھا، پرچے کی اشاعت میں نہ صرف یہ کہ بہت حد تک باقاعدگی پیدا ہو گئی ہے بلکہ پرچے کے معیار میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں قارئین کی جانب سے تائید و تحسین کے متعدد خطوط موصول ہوئے ہیں جو بلاشبہ ہمارے لئے باعثِ حوصلہ افزائی ہیں۔ گو ابھی ایک پہلو سے بہتری کی گنجائش موجود ہے کہ پرچہ عموماً قدرے تاخیر سے شائع ہوتا ہے۔ لیکن اگر اللہ کی تائید اور قارئین کی دعائیں ہمارے ساتھ رہیں تو ان شاء اللہ اس کمی پر بھی قابو پا لیا جائے گا۔

زیرِ نظر شمارے میں دیگر مضامین کے علاوہ، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے ایک نئے تعلیمی منصوبے 'قرآن کالج' کا مفصل تعارف شامل ہے جس میں اس تعلیمی اسکیم کے مقاصد کی وضاحت کے ساتھ ساتھ کالج کے نصاب اور قواعد و ضوابط کی مکمل تفصیل بھی موجود ہے۔ اس اسکیم کی رُو سے انٹر پاس طلبہ کو کالج میں داخلہ دیا جائے گا اور پھر تین سال کے عرصہ کے دوران انہیں بی اے کے امتحان کی باقاعدہ تیاری بھی کرائی جائے گی اور اس کے ساتھ ساتھ ایک معیّن دینی نصاب کی تعلیم بھی دی جائے گی۔ اس نصاب کی تفصیلات سے قطع نظر، کہ وہ تو اسی شمارے کے متعلقہ صفحات میں مذکور ہیں، یہاں اس نصاب کے صرف دو اہم امتیازات کی جانب اشارہ کر دینا کافی ہوگا۔ ایک تو یہ کہ اس میں عربی زبان کی مضبوط بنیادوں پر تحصیل پر خصوصی زور دیا گیا اور دوسرے یہ کہ پورے قرآن کا ترجمہ مع مختصر تشریح بھی اس نصاب میں شامل ہے یہ دو چیزیں بلاشبہ ایسی ہیں کہ اگر اللہ کی توفیق سے یہ تعلیمی منصوبہ کامیابی سے چلا تو یہی دو چیزیں قرآن کالج کا طرۂ امتیاز ہونگی۔ ہم توقع کرتے ہیں کہ قارئین 'حکمتِ قرآن' اپنے حلقہ احباب اور عزیز و اقارب میں بھرپور طور پر قرآن کالج کو متعارف کرائیں گے اور ایسے نوجوانوں کو قرآن کالج میں داخلے پر خصوصی طور پر آمادہ کریں گے جو نہ صرف یہ کہ انٹر پاس کر چکے ہوں بلکہ دین کی جانب ایک میلان بھی رکھتے ہوں ☆☆☆

حکم وعبر

ڈاکٹر ابصار احمد

اسلام اور سیکولرزم

یہ مقالہ خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کی برسی کے موقع پر ادارہ ثقافتِ اسلامیہ
کے زیر اہتمام منعقدہ تقریب میں ۷ فروری ۸۰ء کو لاہور میں پڑھا گیا ::

اہلِ علم کے نزدیک یہ امر مسلّم ہے کہ مختلف تہذیبی، علمی اور ثقافتی الفاظ و تصورات ایک خاص روایت سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کا ایک مخصوص زبان سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اور بالعموم ان کا مفہوم کسی دوسری زبان کے ایک لفظ میں کاملتاً منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ بالفاظِ دیگر اصطلاحات کے معانی و مفاہیم مختلف مباحث کے پس منظر (Context) میں یکساں نہیں رہتے۔ اور یہ حقیقت مختلف تہذیبوں اور نظامہائے افکار کے تقابلی مطالعے میں بدرجۂ اتم واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔

میں اس مقالے میں قدرے تفصیل سے اس امر کا جائزہ لوں گا کہ "ریلیجن" یعنی مذہب اور "سیکولرازم" کے الفاظ اور ان کے جملہ مفاہیم کی کیفیت اسلام کے بنیادی اصولِ فکر کے حوالے سے کیا بنتی ہے اور اس ضمن میں یہ بھی وضاحت کرنے کی کوشش کروں گا کہ آج کل بعض اصحابِ علم اور دانش ور کن مغالطوں کا شکار ہو کر اسلام اور سیکولرازم کے موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں اور بالکل غلط طور پر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کے افکار اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں۔[1]

---

[1] مثلاً پروفیسر وارث میر اپنے حالیہ سلسلۂ مضامین 'نوید فکر' میں سیکولرازم اور جدیدیت کی حمایت کرتے ہوئے خلیفہ عبدالحکیم کو اپنا مؤید اور ہم خیال تصور کرتے ہیں۔

"ریلیجن" اور "سیکولرازم" کی مغربی فکر میں دوئی اور کسی حد تک نظری و فکری مخاصمت میرے خیال میں ناقابلِ تردید حد تک واضح ہے۔ "سیکولرازم" کی جو تعریف انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس مطبوعہ ۱۹۰۵ء (ایڈیٹر، جیمز ہیسٹینگز) میں دی گئی ہے اس کے مطابق انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں یورپ میں پیدا ہونے والی اس فکری تحریک کے پس پردہ مخصوص سیاسی اور فلسفیانہ محرکات تھے۔ اس کا نقطۂ نظر مذہب کے بارے میں اکثر و بیشتر منفی رہا ہے۔ انسانی زندگی اور ضابطۂ حیات کے بارے میں یہ ایک مکمل نظریہ ہے جس میں مذہبی اور مابعد الطبیعاتی معتقدات کی بجائے اصل زور مادی وسائل اور انسانی سوچ پر ہے۔ اگرچہ انگلستان میں اس نقطۂ نظر اور "سیکولرازم" کی اصطلاح کو رواج دینے والے سیاسی اور سماجی کارکن جارج جیکب ہولی اوک (۱۸۱۷ — ۱۹۰۶) کی کوشش تھی کہ اس فکر کو صرف سماجی خوشحالی مادّی ترقی اور سیاسی آزادی کے حصول کے لئے استعمال کیا جائے اور عیسائیت دشمنی کو اس کا لازمی عنصر نہ خیال کیا جائے۔ لیکن اس کے بعض اہم رفقاء بالخصوص چارلس بریڈلا، چارلس واٹس اور جی ڈبلیو فٹ مذہبی عقائد کی تردید پر مُصر تھے۔ اور مادّی ترقی اور دنیاوی خوشحالی کے لئے ابطالِ مذہب اور الحاد کو ضروری تصوّر کرتے تھے۔ اس تحریک سے وابستہ افراد کا بنیادی فکر یہ ہے کہ مذہب اور سائنس کا تعلق دو علیحدہ اور مختلف دنیاؤں سے ہے — سائنس ہمیں اس مادّی دنیا کا علم دیتی ہے۔ چنانچہ ہر وہ چیز یا ہر وہ علم جس کا تعلق اس آب و گل کی دنیا سے ہے، سیکولر ہے اور انسان کو چاہیئے کہ وہ مختلف علوم، انسانی مشاہدات و تجربات اور عقل و خرد کی بنیاد پر زندگی کا لائحۂ عمل طے کرے اور سیاسی و معاشرتی نظام وضع کرے۔ سماجی و معاشرتی قوانین کا پہلو پہلے بھی عیسائیت میں نہ ہونے کے برابر تھا۔ کیونکہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ رفعِ عیسیٰؑ کے بعد جلد ہی پال نے قوانین کو تعلیماتِ عیسیٰؑ سے بالکلیہ خارج اور ساقط کر دیا تھا اور مذہب کو صرف چند ناقابلِ فہم عقائد (Dogmas) تک محدود کر کے عملی زندگی، اخلاق اور قانون سے اس کا کوئی تعلق باقی نہ رکھا تھا۔ چنانچہ اگر دقّتِ نظر سے دیکھا جائے تو تاریخی طور پر مذہبی یا 'ریلیجیس' اور دنیاوی یا 'سیکولر' کی تقسیم دنیائے عیسائیت میں پہلے ہی موجود تھی۔ گذشتہ صدی کی سیکولرسٹ تحریک نے

اسے زیادہ علمی اور سائنٹیفک انداز میں زوردار طریقے سے پیش کیا۔ اس میں جہاں ایک طرف سیاسی جبر و استبداد اور استحصالی قوتوں کے خلاف آواز اٹھائی گئی، وہاں دوسری جانب مذہب اور مذہبی اندازِ فکر کی بجائے انسانی فکر اور سائنسی منہاج کو دنیاوی معاملات و مسائل کے حل و کشود، ترقی اور سماجی بہتری کے حصول کی کلید قرار دیا گیا۔ اگرچہ سیکولر تحریک سے منسلک اکثر مفکرین نے وجودِ باری تعالےٰ، آخرت اور دوسرے مذہبی عقائد کی علمی طور پر تردید نہیں کی، لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ انہوں نے ان معتقدات کو مثبت طور پر لائقِ اعتنا اور غور و فکر کے قابل بھی نہ جانا۔ اور یہ عدم توجہی کا رویہ بھی بڑی حد تک مذہب کی نفی پر منتج ہوا۔

ایک اہم یورپی مفکر C.A. Van Peursen نے سیکولرازم کے نقطۂ نظر پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے اس کے تین اہم عناصر یا نکات کی نشاندھی کی ہے جو مندرجہ ذیل ہیں :—

1 Disenchantment of Nature

2. Desacralization of Politics

3 Deconsecration of values

پہلے عنصر کے مطابق کائنات کسی مافوق الفطرت ہستی کی پیدا کردہ نہیں اور نہ ہی اسے کسی الوہی ہستی سے وابستہ سمجھا جا سکتا ہے۔ دوسرے نکتے میں سماجی اور سیاسی مسائل اور قوانین کی مذہبی تقدس سے علیحدگی اور تیسرے نکتے میں اقدار اور بالخصوص اخلاقی اقدار کا بالکلیہ انسانی پسند و ناپسند پر انحصار اور خیر و شر کے مذہبی عقائد سے لاتعلق ہونا بیان کیا گیا ہے[1]

گزشتہ صدی میں انگریز مفکر چارلس بریڈلا اور اس کے ساتھیوں کی الحاد پسندی اور اس صدی کے فلسفی ادیب وان پیورسین کی مندرجہ بالا تصریحات کے بعد میں نہیں سمجھتا کہ پروفیسر وارث میر صاحب کے اس خیال میں کہ " یہ امر واقعی ہے کہ مغرب میں اس اصطلاح سے مذہب دشمنی یا لادینیت کبھی بھی مراد نہیں لیا گیا " کیا صداقت رہ جاتی

---

[1] مضمون : نوید فکر، ایک اہم سیاسی اصطلاح کا گمراہ کن مفہوم، قسط نمبر ۲، روزنامہ "جنگ" لاہور

ہے۔ اسلام، اس کے بنیادی معتقدات اور اساسی فکر کا شعور رکھنے والے ہر شخص کے لئے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ "ریلیجن" اور "سیکولرازم" کے الفاظ اور ان کے مخصوص معانی جو یورپی فکر اور زبانوں سے مختص ہیں، اسلام، عربی اور اسلامی علمی ذخیرے میں قطعاً نہیں پائے جاتے۔ یہ صرف مغربی تعلیم کا اثر اور مغربی تصورات کی سحر کاری ہے کہ ہمارے ملک کے بعض دانشور اور صحافی حضرات بھی اسلام کی وحدت میں مذہب اور سیکولر رویئے کی دوئی کے قائل نظر آتے ہیں۔ یہ حضرات شعوری یا غیر شعوری طور پر مذہب کا صرف ایک انتہائی محدود اور انفرادی زندگی یا رسمی عبادات (Prayers and rituals ———) سے متعلق دنیائے عیسائیت کا سا تصور رکھتے ہیں جس میں عقائد غیر محقق، ناقابل فہم اور توہماتہ ہوتے ہیں۔ اور کتنا صحیح کہا ہے فرانسس بیکن[1] نے کہ "توہم پرستی دہریت سے بدتر ہے۔ خدا کی نسبت بے اعتقادی ایسے اعتقاد کی نسبت بہتر ہے جو خدا کو ذلیل کرے اور اس کے شایانِ شان نہ ہو۔ پہلی حالت تو محض بے اعتقادی ہے اور دوسری خدا کی تذلیل و تحقیر۔ توہم پرستی بے اعتقادی کی نسبت زود تر بد اخلاقیاں پیدا کرتی ہے۔ توہم پرستی مملکت کے لئے بھی خطرناک ہے۔ کیونکہ اس سے ایسی قوتیں پیدا ہو سکتی ہیں جو مملکت کی قوت سے بڑھ کر ہوں۔ اس حالت میں عقلمند مجبور ہوتے ہیں کہ احمقوں کی پیروی کریں۔"

سیکولرازم کے محولہ بالا تین مرکزی نکات کا اسلام سے تصادم و تخالف ملاحظہ فرمایئے:

از روئے قرآن زندگی کے حوادث اور کائنات کے مظاہر انسان کو کسی حقیقتِ ازلی کی خبر دیتے ہیں۔ یہ آیات یا نشانیاں ہیں ان حقائق کی جو نظر سے اوجھل ہیں لیکن بصیرت پر منکشف ہو سکتے ہیں۔ آیاتِ قرآنی کی طرح قرآن نے مظاہرِ فطرت کو بھی آیات کہا ہے۔ کیونکہ یہ تمام نشانیاں ہیں جو ایک حکیم و رحیم خالق کی طرف راہنمائی کرتی ہیں۔ اور اس کا تقاضا

---

[1] فرانسس بیکن پیدائش ۱۵۶۱ء وفات ۱۶۲۶ء بحوالہ "تاریخ فلسفۂ جدید" جلد اوّل ص: ۲۳۵

کرتی ہیں کہ انسان میں وہ نظر پیدا ہو جائے جو منظورِ حقیقی کو براہِ راست دیکھ سکے۔ اہلِ ایمان کی صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ زمین و آسمان کی بناوٹ پر غور کرتے ہیں (یَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔ آلِ عمران: آیت ۱۹۱)۔ اس اعتبار سے ایک سائنسدان وہی کام کرتا ہے جو ایک فطرتِ سلیم رکھنے والا شخص کرتا ہے۔ تاہم دونوں میں فرق یہ ہے کہ سائنسدان کا عمل صرف تحقیق و علم اور عملی ایجادات کے لئے ہوتا ہے اور مومن کا عمل عبرت، عرفانِ حقیقت اور اثباتِ توحید کے لئے۔ گویا سیکولرازم کے نقطۂ نظر کے برخلاف قرآن میں کائنات اور کائناتی واقعات کو ایمانی دعوت کے حق میں بطور استدلال پیش کیا گیا ہے۔ ایک سلیم الفطرت اور صاحبِ بصیرت انسان کو ساری کائنات صفاتِ خداوندی کا ظہور نظر آنے لگتی ہے۔ اسلام نے شرک اور اوہام کو ختم کر کے توحید کو غالب کیا اور اس طرح اس ذہن کو فروغ دیا جس نے عالمِ فطرت کی تحقیق کا راستہ کھولا۔ مسلمانوں کی سائنسی تحقیق اور ترقی کے سلسلے میں عقیدہ توحید کی اہمیت کو بریفالٹ اور آرنلڈ ٹائن بی (۱۹۷۵ - ۱۸۸۹) نے بھی واشگاف الفاظ میں تسلیم کیا ہے۔

اب آیئے دوسرے اور تیسرے نکتے کی جانب۔ اسلام کے لئے اصلاً قرآنی اصطلاح "دین" مستعمل ہے۔ جس کا مفہوم بہت وسیع اور ہمہ گیر بھی ہے اور نہایت گہرا اور وسیع الذیل بھی۔ تصورِ خدا اور دیگر ایمانیات سے لے کر انسانی زندگی انفرادیت اور اجتماعیت کے تمام پہلو اس کے اجزا رہیں۔ اخلاقی اقدار کے ساتھ ساتھ انسانی معاشرت اور سیاست کے اصول بھی اس میں پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ اسلام دُنیائے عیسائیت کے تصورِ مذہب کے مطابق چند فرسودہ عقائد (Dogmas) اور بے روح رسمی عبادتوں (Rituals) کا مجموعہ نہیں، بلکہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب خود بہت سے مغربی مفکرین اور مستشرقین 'دین' کے لئے 'A Complete code or way of life,' کی مفصل تشریحی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔

خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کا فکر اس مسئلے پر بالکل واضح اور راسخ العقیدہ جمہور مسلمانوں کے فہمِ اسلام کی پُرزور پیرائے میں تائید کرتا ہے۔ چنانچہ آپ کی اہم تصنیف 'اسلامک آئیڈیالوجی' کے

ابتدائیے میں درج ذیل سطور لائق توجہ ہیں :

1. Islam was not satisfied with preaching only broad principles, it was considered essential to create a system and a discipline which should embody those principles in individual and social life. It is a complete code of life based on a definite out look on life.

2. The Muslims believe that the essentials of Islam are eternal and so is the system called Shariat. The belief of the auther is that the essential framework of the Shariat too, which can be studied from the teachings of the Quran and the authentic sayings and practices of the prophet, rests on eternal verities. It is a creed that can never become outworn

اسی طرح علامہ اقبال علیہ الرحمہ پر اپنی ضخیم اور انتہائی وقیع کتاب ' فکرِ اقبال ' کے صفحہ ۶۸۲ پر رقم طراز ہیں :

" اسلام دین اور دنیاوی زندگی کی تقسیم و تفریق کا قائل نہیں۔ اس کی وحدت زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہے۔ دنیا کو ایک خاص زاویۂ نگاہ سے برتنا ہی دین ہے۔ "

خلیفہ صاحب کے انتقال کے بعد مرحوم جسٹس اس اے رحمان کے پیش لفظ کے ساتھ شائع ہونے والی کتاب The prophet and His Message کے باب بعنوان ' اسلام اور ڈیموکریسی ' میں ایک آئیڈیل اسلامی ریاست اور ہیئت اجتماعیہ کے اہم خدوخال فاضل مصنف نے چودہ نکات میں پیش کئے ہیں۔ جن میں سے مندرجہ ذیل تین موضوع زیر بحث کے اعتبار سے انتہائی اہم ہیں اور جو خلیفہ صاحب کی اصابت رائے پر دال ہیں۔

1. Sovereignty belongs to God alone whose chief attributes are wisdom, justice and love. He desires human beings to assimilate there attributes in their thoughts, words and deeds.

2. An Islamic state is not theocratic but ideological. The rights and duties of its citizens shall be determined by the extent to which they identify themselves with this ideology.

3. There shall be no special class of priests in an Islamic

society though persons leading better religious life and possessing better knowledge of religious affairs have a ligitimate claim to honour They shall enjoy no special privileges legal or economic.

اختتامی پیراگراف میں لکھتے ہیں :

These are the fundamentals of an Islamic constitution that are unalterable. No ruler or no majority possesses any right to tamper with them or alter them. This is eternal Islam rooted in the God-Centred humanity.

ہمارے ہاں کے بعض دانشور جو بزعم خویش روشن خیال، بالغ نظر، بیدار مغز اور ترقی پسند بننا یا کہلوانا چاہتے ہیں قرآن اور نبی اکرمؐ کی تعلیمات میں جمود اور ناگوار قطعیت کے شاکی نظر آتے ہیں لیکن سطور بالا میں خلیفہ عبدالحکیم اسلام کے اساسی احکام کو غیر تبدیل (Unalterable) قرار دے رہے ہیں۔ اور جمہور کو بھی ان میں کسی تبدیلی کا مجاز قرار نہیں دیتے۔ اسی طرح یہ حضرات سمجھتے ہیں کہ قانون، ریاست اور حکومت کے معاملات میں دین کے عمل دخل کا لازمی نتیجہ تاریخی طور پر دنیائے عیسائیت کی تھیوکریسی ہے۔ حالانکہ یہ بات علمی طور پر قطعاً غلط اور لغو ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کے اوپر دیئے گئے انگریزی اقتباسات سے بھی اس کی تائید وتصدیق ہوتی ہے۔ اردو میں ان کی مزید تشریح خود اُن ہی کے الفاظ میں سُنئے۔ تاکہ کسی کو میری ترجمانی پر اعتراض کی گنجائش نہ رہے۔ "فکرِ اقبال" کے صفحہ ۲۸۲ پر رقمطراز ہیں :

"اسلام کے نزدیک مملکت وحدت آفرینی کی کوشش اور روحانیت کو عملی جامہ پہنانے کا ایک وسیلہ ہے۔ اسلام فقط انہی معنوں میں تھیوکریسی یا دینی مملکت ہے۔ اسلام کو تھیوکریسی کے عیسوی اور مغربی مفہوم سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہمارے ہاں پاپائے معصوم و آمر اور کلیسا اور پروہتوں کا نظام نہیں جو مغربی انداز کی تھیوکریسی پیدا کرتا ہے۔"

The prophet and His Message کے باب بعنوان Law and Islam کا درج ذیل اقتباس اسلام اور سیکولرازم کے موضوع پر خلیفہ صاحب کا واضح ترین علمی موقف ہے جس کا مطلب بالکل صاف اور ہر ابہام اور شک وشبہ سے بالاتر ہے

Islam without being a theocracy in the sense in which the West uses this word insisted on the common foundation

of religion, morality and law. In Islamic society, law cannot be secular in the sense that it should renounce any connection with religion. For a Muslim religion is an all-comprehensive reality.

Personal morality, social relationship, private law, public law, inter-faith or international relations must be justified or referred back to the fundamentals of Islam.

سیکولرازم کے حامی انسانی زندگی اور معاشرت کے مسائل عقل، سائنس اور سائنسی منہاج کے ذریعے حل کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ پروفیسر وارث میر صاحب محولا بالا مضمون میں لکھتے ہیں :

" (سیکولرازم) سے مراد ایک ایسا سیاسی یا معاشرتی نظام لیا جاتا رہا ہے جس کی اساس مذہبی امتیازات اور عقائد کی بجائے سائنس اور عقل پر ہو (اور اسلام سائنس کے خلاف نہیں ہے)"

لاریب، اسلام سائنس اور عقل کے خلاف ہرگز نہیں ہے۔ لیکن کیا اسلام اس کی اجازت دے گا کہ اس کے پیش کردہ واضح دینی تصورات اور صریح احکامات میں بھی آپ اپنی عقل اور سائنس کا استعمال شروع کر دیں۔ اس صورت میں مذہب اور " سائنٹزم Scientism میں کیا فرق رہ جائے گا۔ اور کاش کہ پروفیسر صاحب سائنس اور سائنٹیفک منہاج کے بارے میں جدید مفکرین بالخصوص سوشل نقاد لوئیس ممفوڈ اور فرانسیسی ماہرین سائنس و اجتماعیات رینے ڈوبو اور ژاک ایلل کے خیالات پڑھ لیں تو ان پر تازہ ترین صورتِ حال کا انکشاف ہو۔ یہ بات گزشتہ صدی کی ہے جب سائنس اور سائنٹفک منہاج کے علمبرداروں کا خیال تھا کہ یہ طریق تحقیق ان کے ہر عقدے اور ہر مسئلے کے حل میں ممد ہوگا۔ ان کا خیال تھا کہ سائنس کی ترقی لامحدود ہے اور اس کے ذریعے انسان ایک آئیڈیل معاشرہ اور پُرسکون زندگی حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن موجودہ صدی کے وسط میں دنیا کے عظیم دانشوروں اور اہلِ سائنس نے اقرار کر لیا ہے کہ یہ سب خوش فہمی تھی۔ سائنس ۔ ٹیکنالوجی ۔ پروگریس ۔ اقتصادی ترقی ۔ ڈویلپمنٹ اور جدیدیت پر مشتمل جو لائحہ عمل مغربی فلاسفہ اور اہلِ دانش نے اپنے لئے تجویز کیا تھا۔ اب بہت سے اہلِ عقل و بصیرت کو دعوتِ فکر دے رہا

ہے اور ان کی سوچ میں ایک بنیادی تبدیلی کا متقاضی ہے۔ چنانچہ اب متعدد مفکرین اس امر کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں کہ طبیعی علوم اور سائنٹفک منہاج کو دوبارہ مابعد الطبیعات سے مربوط کیا جائے۔ پچھلی صدی کے سائنسی علمیاتی نظریات میں اقدار، مذہبی جذبات اور ــــ مابعد الطبیعاتی افکار کو بالکل فرسودہ اور غیر متعلق تصوّر کیا گیا تھا لیکن منہاجیات کے موضوع پر گزشتہ دس پندرہ سالوں کے دوران جو اہم مقالات شائع ہوئے ہیں ان میں گزشتہ صدی سے رائج وحدانی اور لاقدری (Value-free or positivistic) قسم کا منہاج شدید تنقید کا نشانہ بنا ہے۔ ان جدید مفکّرین کا خیال ہے کہ علم کے منہاج کو وسیع النظری کے ساتھ کسی سوسائٹی کے تہذیبی اور دینی خیالات کو استعمال کرتے ہوئے آگے بڑھنا چاہیئے۔ ان مفکّرین میں پال فیرآبنڈ، اوپن ہائمر، شوڈنگر اور فرتھ جوف کاپرا کے نام سرِفہرست ہیں۔ اب یہ بڑے پیمانے پر تسلیم کیا جارہا ہے کہ مغربی سائنس، اس کی مادّہ پرستانہ تہذیب اور اس کے ملحدانہ علمی منہاج نے انسانیت کے قافلے کو ذہنی امن وسکون اور صحت مند ترقّی کی بجائے الٹا نقصان پہنچایا ہے اور تباھی کی طرف دھکیلا ہے۔ یورپ کے بعد اب امریکہ کے بعض دانشور بھی 'جدیدیت' اور 'سائنٹفک ترقی'، جیسے تصوّرات کی محدودیت اور نقائص کے قائل ہوتے جارہے ہیں۔

اور عقلِ انسانی کا معاملہ جس پر سیکولرائزیشن کے حامی تکیہ کرتے ہیں، کیا مختلف ہے؟ بقول علّامہ اقبالؒ ؎

'عقل عیّار ہے سو بھیس بنالیتی ہے'

کیا فرائڈ نے اس حقیقت کو مبرھن نہیں کر دیا کہ عقل طبیعی یا عقل جُزئی حیوانی سطح اسفل اکثر رہے جذبات، مرغوباتِ نفس اور تعصّبات کی غلامی کرتی ہے۔ یہ مادیات اور طبیعات میں محصور خرد انسان کو تشکیک اور تذبذب کی بھول بھلیوں سے نہیں نکال سکتی۔ انسانی عقل کو جو اپنے محدود مشاھدات اور تجربات سے اصولِ حیات اور نظریہ حقیقت کا استقرار کرنا چاہتی ہے، نہ آدم کی روح ملکوتی اور اس کے لامحدود امکانات کا ارتقاء سمجھ میں آسکتا ہے اور نہ نبی کی نبوّت۔ واقعہ یہ ہے کہ ایمان اور تزکیہ نفس ہی سے عقل میں وہ رُوحانی تنویر پیدا ہوتی ہے جو اسے شہوات کی غلامی اور حیلہ گری سے نجات دلاتی ہے۔ مغرب کی تعلّی آمیز اور مائل بہ الحاد عقلیت ہی سے بیزار ہو کر شاعرِ مشرق

علامہ اقبالؒ نے انسانی عقلِ محدود کو الحاد آفریں، بہانہ جو اور فسوں گر کہا ہے۔ اور اس کی کوتاہ نظری اور حقیقت نارسی کا بیان مختلف پیراؤں میں کیا خوب کیا ہے:

ے خرد واقف نہیں ہے نیک و بد سے
بڑھی جاتی ہے ظالم اپنی حد سے

ے علاج آتشِ رُومی کے سوز میں ہے ترا
تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

ے ہے ذوقِ تجلّی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے
وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن
پُرکار و سخن ساز ہے نم ناک نہیں ہے

اور ے تو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر
میری دانش ہے افرنگی مرا ایمان ہے زناری!

خلیفہ عبدالحکیم مرحوم جو خود علامہ اقبالؒ کی طرح قدیم اور جدید تفلسف میں تربیت یافتہ تھے اور عذابِ دانشِ حاضر سے پوری طرح باخبر اور سوختۂ نارِ افرنگ تھے، اپنی تصانیف میں تکرار اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ یورپ اور مغربی سائنس کے پاس محدود عقل و خرد کے سوا کوئی ذریعۂ علم نہیں ہے۔ اور خرد کے نظریات ہر دم متغیر اور باہم متصادم رہتے ہیں۔ چنانچہ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ خود انہیں علمی و فکری اماں بھی تو عارف رومیؒ کے "اختلاطِ ذکر و فکر" میں۔

پروفیسر وارث میر صاحب نے سیکولرازم کا فلسفہ اور استدلال پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر حسین نصر کے افکار پر بھی گرفت کی ہے۔ اس بحث کو کسی دوسری نشست کے لئے مؤخر کرتے ہوئے آخر میں اُن کے ایک خیال کی تصحیح ضروری سمجھتا ہوں۔ پروفیسر صاحب لکھتے ہیں:—

"مسلمانوں نے دنیاوی ترقی کی خواہش کو مغربیت کا متبادل تصور کر لیا۔ لفظ دنیا سے نفرت ہی لفظ سیکولرازم سے نفرت کی بنیاد بنا۔"

حقیقت یہ ہے کہ معاملہ صرف الفاظ کا نہیں ان کے مفاہیم اور پس پردہ نظریات کا ہے۔ سطورِ بالا میں میں نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ سیکولرازم کسی طور بھی اسلام کے ساتھ میل نہیں کھاتا۔ اسلام دنیاوی اور سائنسی ترقی کے نہ کبھی ماضی میں آڑے آیا ہے اور نہ آج ہے۔ دنیاوی ترقی کا کوئی پہلو اس وقت غیر مطلوب ہے جب وہ مسلمان کو اپنی حقیقت اور باطنی شخصیت کی طرف سے غافل کر دے اور اپنے خالقِ حقیقی سے بھی محجوب کر دے۔

جہاں تک حُرّیتِ فکر اور ارتقاءِ حیات و تمدنِ انسانی کے پیشِ نظر "خرد افروزی" فکرِ نو اور اجتہاد کا سوال ہے میں سمجھتا ہوں کہ قرآن و سنّت نے اس باب میں ہماری سوچ اور ذہن کے عمل دخل اور کارفرمائی کے لئے بڑی کھلی گنجائش فراہم کی ہے۔ ایک طرف دین کے صریح اوامر ہیں جن میں فرض، واجب، سنّت مؤکّدہ اور سنّتِ غیر مؤکّدہ کی تخصیص اور درجہ بندی ہے اور دوسری طرف صریح اور منصوص تحریمات ہیں جن میں مکروہاتِ تحریمی اور مکروہاتِ تنزیہی شامل ہیں جو اگرچہ حرام مطلق نہیں۔ ان دو فصیلوں کے درمیان مباحات کا ایک وسیع دائرہ ہے جہاں مسلمان جمہور اپنے لیجسلیٹو یعنی قانون ساز اختیار استعمال کر سکتے ہیں۔ لیکن یہاں بھی میں یہ عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ یہ اجتہادی فکر نو پروفیسر وارث میر صاحب کی رائے کے برعکس "سیکولر" نہیں ہوتا کیونکہ صدقِ دل سے کلمۂ توحید اور اثباتِ رسالت کے بعد ایک مومن صادق کی شرح اور نظر قولِ رسولؐ کے مطابق ایمانی اور نورانی ہو جاتی ہے۔ (اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ)۔

جو لوگ اسلام کی اساسات، اس کے تہذیبی ڈھانچے اور متّفقہ و مسلّم قانونی پہلو میں ترقی پسند، روشن اور بگ ٹٹ جدیدیت کے علمبردار ہیں ان کے علم میں یہ بات رہنی چاہیئے کہ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر دنیائے اسلام میں اسی قسم کا فکری انقلاب لانا چاہتے ہیں جو موجودہ صدی میں بعض "روایت شکن" دانشوروں اور ادیبوں کی تحریروں سے مغرب میں آیا جن میں رروڈلف بلٹمان، بون ہوئے فر، پال ٹلک، بشپ آف وولچ جان رابنسن، ایسٹائر کی اور دوسرے بہت سے مفکّرین اور ادیب شامل ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ ان جدید افکار کے زیرِ اثر عیسائیت میں سے ایک مابعد الطبیعاتی مذہبی روایت کی حیثیت سے بچی کھچی

روح بھی نکل گئی اور وہ ایک کلچرل "کلٹ" کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ چنانچہ مسیحی دنیا میں اب "ڈیتھ آف گاڈ تھیالوجی" اور خدا کے وجود پر ایمان و یقین کے بغیر کرسچیئن یقین (Faith) کے موضوع پر کتابیں اور مقالات لکھے جا رہے ہیں۔ اور عملی اعتبارات سے ہر قسم کی اخلاقی و جنسی بے راہ روی کے لیئے سندِ جواز فراہم کیا جا رہا ہے۔ ہمارے مسلمان دانشوروں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ عیسائیت کے برخلاف قرآن اور اسلام کی تعلیمات بالکل واضح، فطری اور عقلِ سلیم کے عین مطابق ہیں۔ ان میں متھس (Myths) کا شائبہ تک نہیں جن کی متھ شکنی (Demytholigizing) کے لیئے کسی روڈلف بلٹمان کی ضرورت پڑے ::

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

کے زیر اہتمام

قرآن اکیڈمی کے بعد اب

قرآن کالج اور آڈیٹوریم

انجمن خدام القرآن کے مقاصد اور لائحہِ عمل سے آگہی اور اتفاق رکھنے والے مخیّر خواتین و حضرات یہ جان کر مسرّت محسوس کریں گے کہ نیو گارڈن ٹاؤن لاہور کے اتاترک بلاک میں لاہور ڈویلپمنٹ اتھارٹی سے حاصل کردہ پلاٹ نمبر اے۔ ۱۹۱ پر مجوّزہ قرآن کالج اور آڈیٹوریم کی تعمیر کا کام پورے زور و شور اور قرینے سے شروع ہو چکا ہے۔ شاندار اور جدید ترین تصریحات کے مطابق آڈیٹوریم مروّجہ آرکیٹیکچر اور ملک کے ایک ممتاز سٹرکچرل ڈیزائنر کی کاوش کا مظہر ہے جو نو سو (۹۰۰) نشستوں پر مشتمل ہو گا اور اس اعتبار سے شاید اپنی نوعیّت کا پہلا آڈیٹوریم ہو کہ یہ صرف اور صرف قرآن حکیم کے پیغام کی نشر و اشاعت کے لیے مخصوص ہو گا۔

تفصیلی تعارف کی ضرورت محسوس ہو تو بروشر طلب فرمائیے۔ عطیات جو حکومتِ پاکستان مالیات و ریونیو ڈویژن دفعہ (لہ) (۱) ۴۷ کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں بذریعہ کراس چیک یا بنک ڈرافٹ (لاہور سے پے آرڈر) مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے نام ارسال کیے جائیں۔

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور
۳۶ - کے ماڈل ٹاؤن لاہور
ٹیلی فون: ۸۵۲۶۸۳- اور ۸۵۲۶۱۱

ہدایت القرآن
مولانا محمد تقی امینی

جنت کی تربیتی زندگی

وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۪ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۪

اور ہم نے کہا اے آدم تم اور تمہاری بیوی جنت میں جاکر رہو اور اس میں سے جو چاہو اور جہاں سے چاہو کھاؤ[۲] اور اس درخت کے قریب نہ جاؤ ورنہ ظالموں (نافرمانوں) میں سے ہو جاؤ گے[۳] پھر شیطان نے ان دونوں سے اسی درخت کے بارے میں لغزش کرادی اور انہیں اس (عزت و راحت کی) جنت سے نکال دیا جس میں وہ تھے[۴]

○

[۱] آدم و حوا پہلے انسان ہیں۔ پیدائش کا جو سلسلہ بعد میں ہوا اس کے مطابق ان کی پیدائش نہ ہوئی تھی۔ اس بنا پر ان میں کچھ ابتدائی (جسمانی و نفسیاتی) کمزوریاں ہو سکتی تھیں جن کے دور کرنے کی ضرورت خلافت و نیابت کا عہدہ سنبھالنے سے پہلے ہو پھر پیدائش کا معاملہ ابھی ابھی کا تھا۔ آنکھیں بھی نہ کھلی تھیں کہ خلافت و نیابت کے عہدہ پر ان کا تقرر ہو گیا نہ کچھ دیکھنے بھالنے کا موقع ملا تھا نہ آبادکاری و نظم و انتظام کو سمجھنے کا کوئی تجربہ ہوا تھا۔ ایسی حالت میں فطری طور پر کمزوری دور کرنے اور کچھ دیکھنے و بھالنے سمجھنے کے لئے ایک مدت تک کھلی فضاء و ہوا میں رکھنا اور وہاں کھانے پینے و رہنے سہنے کے لئے ہر قسم کی آزادی و سہولت دینا ضروری تھا غالباً اسی مصلحت کے پیش نظر آدم و حوا کو جنت میں رکھا گیا اور وہاں ہر قسم کی آزادی و سہولت دی گئی۔

[۲] پھر خلافت و نیابت جیسے عظیم الشان عہدہ کو سنبھالنے کے لئے بڑی ضرورت قوت برداشت و خواہشات پر قابو پانے کی ہوتی ہے۔ ممکن ہے اس ضرورت کے تحت جنت میں ہر قسم کی آزادی کے باوجود ایک درخت کا پھل کھانے سے روک دیا گیا۔

قرآن وحدیث سے یہ معلوم نہیں ہوتا ہے کہ جنت میں آدم وحوّا کتنے دن تک رہے لیکن یہ بات یقینی ہے کہ جس مصلحت سے ان کو وہاں رکھا گیا تھا قیام کی مدت میں اس کا لحاظ کیا گیا ہوگا چنانچہ ایک مدّت کے بعد یہ دونوں حضرات جنّت سے نکال دیئے گئے اور نکالے جانے کی تقریب عجیب وغریب انداز سے انجام پائی جس سے بہت ساری باتیں سمجھی جاسکتی ہیں۔

صورت یہ ہوئی کہ جس درخت کا پھل کھانے سے آدم وحوّا کو روکا گیا تھا شیطان کی سازش سے اس کو کھا لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جنّت میں رہنے اور ٹھہرنے کے قابل نہ رہ سکے۔ جنّتی لباس اتر گیا۔ شرم وندامت کے احساس سے بےچین ہوگئے۔ اللہ کی رحمت ومحبّت کے علاوہ کوئی پناہ کی جگہ نہ رہ گئی بالآخر اللہ ہی نے ان کی طرف توجّہ فرمائی۔ ان کی توبہ قبول کی اور چند ان باتوں کی ہدایت کا پروانہ دے کر زمین میں عہدہ پر بھیجا۔ یا جن کی یہاں قدم قدم پر ضرورت تھی۔

آدم وحوّا نے جنّت کی زندگی سے کیا حاصل کیا اس پر تفصیلی گفتگو کا یہ موقع نہیں ہے لیکن اتنا تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ وہاں کی کھلی فضا میں آزادی کے ساتھ اپنی خواہش کے مطابق کھاتے پیتے رہتے سہتے رہے اور جنّت کی آبادکاری ونظم ونسق کو دیکھتے بھالتے اور سمجھتے رہے جس سے ایک طرف جسم میں قوّت آئی دوسری طرف سوجھ بوجھ میں وہ لیاقت ابھری جو ابتدا میں عہدہ سنبھالنے کے لائق بناتی ہے۔ تیسری طرف ایک عرصہ تک درخت کا پھل کھانے سے رُکے رہنے کے باعث قوّتِ برداشت آئی اور خواہشات پر قابو پانے کی تربیت ہوئی آخر شیطان نے ایک ہی دن میں تو درخت کا پھل کھانے پر نہ آمادہ کیا ہوگا بلکہ کافی دنوں تک رغبت دلاتا رہا ہوگا اور یہ دونوں اپنی طبیعت کو مارتے اور خواہش کو دباتے رہے ہوں گے اور چوتھی طرف خود کو سمجھنے اور اللہ کو پہچاننے کی صفت ابھر آئی جو حاصل زندگی ہے۔ اس کا ثبوت اس "سرٹیفکیٹ" میں موجود ہے جس کو لے کر وہ دونوں اپنے عہدہ پر تشریف لائے۔ وہ یہ ہے:

رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ (الاعراف: ۲۳)

اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اگر آپ ہمیں نہ بخشیں گے اور ہمارے اوپر رحم نہ فرمائیں گے تو ہم یقیناً تباہ ہو جائیں گے۔

یہ خود کو سمجھنے اور اللہ کو پہچاننے ہی کا نتیجہ تھا کہ لغزش کے بعد آدم و حوّا دونوں نے اللہ کے حضور عجز و نیازمندی کی گردن جھکا دی اور اللہ نے ان پر اپنی رحمت و محبّت کا سایہ ڈال دیا جبکہ شیطان (جس نے اپنے فریب کے جال میں پھانسا تھا) کا کردار اس کے خلاف موجود تھا کہ اس نے جرم کے بعد کبر و غرور کی روش اختیار کی اور راندۂ درگاہ ہوا۔

جنّت اس وقت آدم و حوّا کے لئے دارالجزاء (صلہ پانے کی جگہ) نہ تھی کہ اس کا ابھی وقت نہ آیا تھا۔ زمین میں عہدہ سنبھالنے کے بعد دونوں کے لئے وہ دارالجزا بنی۔ اسی طرح دارالخلود (ہمیشہ رہنے کی جگہ) نہ تھی کہ انسان کو زمین میں اپنے عہدہ پر آنا تھا۔ ابھی سے ہمیشہ کے لئے وہاں رہنے کا موقع نہ تھا؛ پھر جنّت کیا تھی؟ حالات و قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دارالتربیت (تربیت کی جگہ) تھی۔ دنیا میں آنے سے پہلے آنے کے لائق بنانے کے لئے زندگی کی تربیت وہیں ہوئی تھی۔

جنّت کہاں اور کس عالم میں ہے؟ اس کا پتہ چلانا آسان نہیں ہے اور اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ قرآن و حدیث اس سلسلہ میں خاموش ہیں ہمارے اس عالم کے متعلق ابتک جسقدر معلومات ہوئی ہیں انہیں سے انسان حیرت زدہ ہے۔ مثلاً جس زمین پر ہم آباد ہیں یہ ہمارے نظام شمسی کا صرف ایک سیّارہ ہے جو سورج کے مقابلہ میں "مٹر" کے ایک دانہ کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھتا ہے۔ سورج تو سورج سیّارہ مشتری اتنا بڑا ہے کہ اس میں ہماری جیسی ایک ہزار سے زیادہ زمینیں سما سکتی ہیں۔ پھر آسمان پر جو چھوٹے چھوٹے تارے دکھائی دیتے ہیں ان میں اکثر سورج کے برابر اور بہت سے خود سورج سے اتنے بڑے ہیں کہ ان میں دس ہزار سورج سما سکتے ہیں تارے وہ کہلاتے ہیں جو خود بخود روشن ہیں یعنی اس وقت جلتی ہوئی گیس کی حالت میں پائے جاتے ہیں باقی جو ٹھنڈے ہو چکے ہیں جیسے ہماری زمین اور مریخ وغیرہ وہ سیّارے کہے جاتے ہیں اس وقت تک معلوم و مشہور سیّاروں کی تعداد نو ہے ان میں سے بعض سیّارے کے ساتھ ان کے توابع یعنی چاند بھی پائے جاتے ہیں زمین کے ساتھ ایک چاند ہے۔ مریخ کے ساتھ دو اور زحل کے ساتھ نو چاند ہیں۔ سورج جو مختلف عناصر لوہے، ایلومینیم، جست نکل وغیرہ کے جلتے ہوئے بخارات یا گیسوں کا بہت بڑا کرہ ہے۔ اس سے آنے والی روشنی

زمین تک آٹھ منٹ میں پہنچتی ہے روشنی کی رفتار فی سیکنڈ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل ہے۔ یہ صرف ایک عالم یا ہمارا عالم ہے۔ اس کے علاوہ بکثرت ایسے عالم پائے جاتے ہیں جو ہمارے اس عالم سے بالکل باہر نہایت دور دراز فاصلوں پر واقع ہیں۔ ایسی حالت میں جنت جہاں اور جس عالم میں بھی ہو اس کو یقین کرنے اور اس پر ایمان لانے میں کوئی دشواری نہیں رہتی ہے۔

"حوا" کی پیدائش کا ذکر یہاں نہیں ہے صرف جنت میں ساتھ رہنے کا ذکر ہے اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ آدم پوری انسانی برادری کی نمائندگی کر رہے ہیں جس میں مرد و عورت سبھی شامل ہیں۔ آدم کے ذکر میں حوا بھی آگئیں علیحدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی البتہ وہاں دونوں کا ایک ساتھ ذکر کیا گیا جہاں ذکر کے بغیر چارہ نہ تھا یعنی جنت کی تربیتی زندگی اور زمین کی عملی زندگی کہ ان دونوں جگہ ایک کو دوسرے کے بغیر چارہ نہیں ہے نہ تنہا ایک کی دوسرے کے بغیر تربیت ہو سکتی ہے اور نہ تنہا کوئی خلافت و نیابت کے کاموں کو ٹھیک انجام دے سکتا ہے۔ آگے جس جگہ حوا کی پیدائش کا ذکر ہوگا اس پر کچھ گفتگو کی جائے گی۔

○

ابتداء کی چند ہدایتیں

وَقُلْنَا اهْبِطُوا ۔۔۔ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝

اور ہم نے کہا تم یہاں سے نیچے جاؤ تم ایک دوسرے (انسان اور شیطان) کے دشمن ہوگے اور زمین میں تمہارے لئے ایک وقت ہی تک رہنا اور فائدہ اٹھانا ہے پھر آدم نے اپنے رب کی طرف سے چند باتیں سیکھیں پھر اللہ نے اس کی توبہ قبول فرمائی۔ بے شک وہی توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے ہم نے کہا تم یہاں سے نیچے جاؤ اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جو میری ہدایت پر چلیں گے ان کے لئے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے اور جو کفر کریں گے اور ہماری آیتوں کو جھٹلائیں گے وہ دوزخ والے ہیں۔ اس میں ہمیشہ پڑے رہیں گے۔

لے جنت میں قیام کی مدت گزر چکی تھی۔ اب عہدہ (خلافت و نیابت) پر بھیجنے کا وقت آگیا۔ لازمی طور پر نئی جگہ میں رہنے اور بسنے کے لئے کچھ ابتدائی ہدایات کی ضرورت تھی۔ یہ وہی چند ہدایتیں بیان ہو رہی ہیں۔ ان میں پہلے سب سے بڑی مخالف طاقت (شیطان) سے آگاہ کیا جس سے ہمیشہ دشمنی و رسہ کشی رہے گی اور جو قدم قدم پر خلافت و نیابت کے کاموں میں رکاوٹ پیدا کرنے اور ناکام بنانے میں سرگرم عمل رہے گی پھر یہاں رہنے و قیام کرنے کی مدت کے بارے میں بتایا کہ یہاں ہمیشہ نہیں رہنا ہے بلکہ ایک مقررہ مدت تک رہنا و قیام کرنا ہے۔ پھر یہ بات واضح کردی کہ جتنے دن بھی قیام رہے یہاں بے کار نہیں رہنا ہے بلکہ چند چیزوں سے فائدہ اٹھانا اور ان کی تعمیر و ترقی کرتے رہنا ہے پھر دعا و استغفار کے چند کلمے بھی سکھا دیئے جو بے سہارا زندگی کے لئے سب سے بڑا سہارا تھے۔ مفسرین نے "کلمات" کی تفسیر میں "ھی کلمات الدعا والاستغفار" (دعا اور استغفار کے کلمے) لکھا ہے جن سے مراد اوپر کے وہی کلمے (رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا ۔۔۔ الخ) ہیں اور ان سے زائد کی بھی گنجائش ہے۔

ابتدائی زندگی میں ان چند ہدایتوں کے علاوہ اور ضرورت ہی کیا تھی ضرورت تھی تو اس بات کی تھی کہ وقتاً فوقتاً ہدایتوں کے بھیجنے کا سلسلہ جاری رہے اور ماننے و نہ ماننے والوں کے انجام سے باخبر کیا جاتا رہے چنانچہ اس کا وعدہ بھی کر لیا گیا اور اس پر عمل درآمد بھی برابر جاری رہا۔ انہی ابتدائی ہدایتوں کی بنیاد پر حضرت آدمؑ کو پہلا نبی تسلیم کیا گیا ہے اور مفسرین نے ہر نبی کا کردار بھی وہی بتایا ہے جو آدمؑ کا ہے یعنی زمین کی آبادکاری، اس کی تعمیر و ترقی، اس کا نظم و انتظام چلانا اور اللہ کا قانون اس میں نافذ کرنا۔ چنانچہ خلافتِ آدم کی اوپر والی آیت کی تفسیر میں ہے:

والمراد بہ آدم علیہ السلام لانہ کان خلیفۃ اللہ فی ارضہ وکذلک کل نبی استخلفھم فی عمارۃ الارض وسیاسۃ الناس وتکمیل نفوسھم وتنفیذ امرہ فیھم (بیضاوی بقرہ آیت ۳۶)

"اس سے آدم علیہ السلام مراد ہیں۔ وہ اللہ کی زمین میں اللہ کے خلیفہ تھے۔ اسی طرح ہر نبی کو اللہ نے زمین کی آبادکاری لوگوں کی سیاست، ان کے نفس کو کامل کرنے اور ان میں اللہ کے احکام نافذ کرنے میں اپنا خلیفہ بنایا۔"

اس سے ایک طرف خلافت و نیابت کے کام کی تفصیل معلوم ہوتی ہے اور دوسری طرف ہر نبی کے کام کی وسعت سمجھ میں آتی ہے اور یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ہر انسان اپنے اپنے دائرہ میں اپنی صلاحیت کے مطابق اللہ کا خلیفہ و نائب ہے اور اس حیثیت سے اللہ کے سامنے جواب دہ ہے خواہ زمین کے جس گوشہ میں ہو اور تعمیری کام کا جو میدان بھی سامنے ہو۔ اسی طرح یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ توحید رسالت اور آخرت کی تعلیم (جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے) نئی نہیں ہے بلکہ ابتدا ہی سے اس کا سلسلہ جاری ہے اور یہ اوپر سے نہیں چپکائی جا رہی ہے بلکہ انسان کی فطرت اور گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔

(باقی آئندہ)

معراج النبی

علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسّلام

تالیف

ڈاکٹر اسرار احمد

عمدہ آفسٹ پیپر، اعلیٰ طباعت، قیمت -/۳ روپے

شائع کردہ

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن فون ۸۵۲۶۸۲۱

۴۸ صفحات پر مشتمل ایک مختصر کتابچہ جس میں مؤلف نے نہایت سادہ لیکن مؤثر انداز میں قرآن مجید، احادیث مبارکہ اور عقل و فطرت سے استدلال کرتے ہوئے سیرت طیبہ کے اس عظیم واقعے کا اثبات اس طور سے کیا ہے کہ

واقعۂ معراج

سے متعلق قریباً تمام الجھنیں رفع ہو جاتی ہیں۔

باب سوم

تحریک رجوع الی القرآن

- خانوادۂ ولی اللہیؒ اور تحریک شہیدینؒ
- عیسائیوں اور ہندوؤں کی جانب سے تبلیغی یلغار
- سرسید احمد خاں مرحوم اور آنجہانی غلام احمد قادیانی
- شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی اور شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ
- ڈاکٹر سر محمد اقبال اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین
- مولانا ابوالکلام آزاد اور سید ابوالاعلیٰ مودودی
- امام حمید الدین فراہیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحی

امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے بارے میں ہم اپنا یہ تاثر بھی بیان کر چکے ہیں کہ "دورِ صحابہؓ کے بعد کی پوری اسلامی تاریخ میں اُن کی سی جامعیّتِ کبریٰ کی حامل کوئی دوسری شخصیّت نظر نہیں آتی اور اس میں ہرگز کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ واقعۃً دورِ جدید کے فاتح ہیں۔ ۔ ۔ ۔" اور ساتھ ہی تجدید دین اور احیائے اسلام کے بلند و بالا مقاصد کے لیے اُن کی ہمہ جہتی مساعی کا ایک اجمالی خاکہ بھی بیان کیا جا چکا ہے اور یہ بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ ان مختلف النّوع اور وسیع الاطراف مساعی میں ان کی اہم ترین خدمت یہ تھی کہ انہوں نے "اسلام کا رشتہ اس کی اصل ثابت یعنی قرآنِ حکیم کے ساتھ از سرِ نو قائم کرنے کے طویل عمل کا باقاعدہ آغاز فرما دیا" ——— اور یہ کہ ان کا عظیم ترین کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے توجہات کو از سرِ نو قرآنِ حکیم کے علم و حکمت کی جانب منعطف کر دیا ——— اور اللہ کی رسّی کے ساتھ امّتِ مسلمہ کے تعلّق کو دوبارہ استوار کرنے کی سعی کا آغاز کر کے گویا حضرت ابوبکر صدّیقؓ کے اس قول کے مطابق کہ "لا یصلح آخر ھذہ الامّۃ الّا بما صلح بہ اولھا" اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کی سعی و جہد کی راہ کھول دی"!

اس سے پہلے ہم یہ بھی واضح کر چکے تھے کہ صدرِ اوّل میں اسلام کی عظیم ترین حقیقتیں دو ہی تھیں: ایک ایمان ——— وہ ظاہری اور قانونی و فقہی ایمان نہیں جس کا تعلّق "اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ" سے ہے بلکہ وہ حقیقی اور قلبی ایمان ہو یقین بن کر انسان کے رگ و پے میں سرایت کر جائے ——— اور دوسرے جہاد فی سبیل اللہ جس کا مقصد ہو "شہادت علی النّاس" ——— "اعلاءِ کلمۃ اللہ" اور "اظہارِ دینِ حق علی الدّین کلّہٖ" ——— اور چونکہ ایمانِ حقیقی کا منبع و سرچشمہ ہے قرآنِ حکیم اور جہاد و قتال کی علامت ہے تلوار، لہٰذا "مردِ مومن" کی شخصیّت کا جو ہیولیٰ چشمِ تصوّر کے سامنے اُبھرتا ہے اُس کے ایک ہاتھ میں بالکل بجا طور پر قرآن ہوتا ہے اور دوسرے میں تلوار!

یہ صحیح ہے کہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی اپنی زندگی میں سر بکف، سیف بدست اور کفن بر دوش میدانِ جہاد و قتال میں نکلنے کا مرحلہ نہیں آیا لیکن یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ ان کی وفات کے نصف صدی کے اندر اندر جہاد و قتال فی سبیل اللہ کا جو غلغلہ سرزمینِ ہند میں بلند ہوا وہ تمام تر اُن ہی کی تجدیدی دعوت کی صدائے بازگشت تھی۔ اس لیے کہ خود حضرت سیّد احمد بریلویؒ بھی خانوادۂ ولی اللّٰہی ہی کے تربیت یافتہ تھے اور اُن کے دستِ راست تو تھے ہی شاہ اسمٰعیلؒ ابن شاہ عبدالغنیؒ ابن شاہ ولی اللہؒ۔ اور اگرچہ انجام کار کے اعتبار سے ہندوستان کی یہ پہلی اسلامی تحریک "شعلۂ مستعجل" کا مصداق بن گئی لیکن اس کی خوش درخشیدگی یقیناً ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ یہاں تک کہ واقعہ یہ ہے کہ اس تحریکِ جہاد کے وابستگان کے ایمان و یقین، ذوق و شوق اور جوش و خروش کے تذکرے سے بے اختیار صحابہ کرامؓ یاد آجاتے ہیں اور سخت حیرت ہوتی ہے کہ "ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی!" اور یہ ایک بیّن ثبوت ہے اس کا کہ اگر دعوت کی اساس اور منہجِ عمل وہی اختیار کیا جائے جو اسلام کے صدرِ اوّل میں کیا گیا تھا تو سیرت و کردار کے وہی نمونے آج بھی تیار ہو سکتے ہیں جو دورِ صحابہؓ کا طُرّۂ امتیاز ہیں۔

گویا بقول جگر مرادآبادی ؎

چمن کے مالی اگر بنالیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی

ہندوستان میں انگریز کے باقاعدہ عسکری تسلّط کا آغاز تو ۱۷۵۷ء میں جنگِ پلاسی کے نتیجے میں گویا شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی زندگی ہی میں (ان کی وفات سے چھ سال قبل) ہو گیا تھا تاہم اسے ایک باضابطہ کُل ہند سلطنت بننے میں پوری ایک صدی لگی۔ یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء کے غدر یا بغاوت کی صورت میں آخری ہچکی لے کر ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا ساڑھے چھ صد سالہ دَور ختم ہو گیا۔ اور تاریخِ ہند کے برطانوی دَور کا آغاز ہو گیا۔

اٹھارویں صدی عیسوی کا نصفِ آخر اور انیسویں صدی کا نصفِ اوّل ہند میں سخت اضطراب و انتشار اور شکست و ریخت کا زمانہ ہے جس میں مسلمان بالخصوص حد درجہ مایوسی اور دل شکستگی کا شکار

رہے۔ مایوسی کے اس غلبے میں جب کہ حالت یہ ہوتی ہے کہ ؎

آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں
اور ہو جائے تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام

ظاہر ہے کہ تحریکِ شہیدینؒ ایسی پُرعزیمت دعوت کا پنپنا اور کامیاب ہونا آسان نہ تھا۔ چنانچہ یہی ہوا کہ ۱۸۳۱ء میں شہیدینؒ نے "بخاک وخون غلطیدن" کی روش اختیار کرلی اور اپنے بہت سے رفقاء کے ساتھ جامِ شہادت نوش کرلیا اور اس طرح بالاکوٹ کی فضاؤں میں دعوتِ ولی اللّٰہی کی یہ پہلی صدائے بازگشت دم توڑ گئی ——— اور بعد میں اگرچہ مجاہدین مسلسل ع

"من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را!"

پر عمل پیرا رہے اور ان کی مساعی کا سلسلہ بالآخر ریشمی رومالوں کی تحریک تک ممتد ہوا لیکن ظاہر ہے کہ اُن کا نتیجہ کوئی برآمد نہ ہوسکا ——— اور ہندوستان میں انگریز کا اقتدار اور قبضہ دن بدن مستحکم ہوتا چلا گیا

برطانوی دور میں مسلمانانِ ہند زندگی اور موت کی جس کشمکش سے مسلسل دوچار رہے اس کے متعدّد پہلو تھے، خالص دینی و مذہبی بھی، علمی و فکری بھی، سماجی و مجلسی بھی، اور قومی و سیاسی بھی ——— ان میں سے اس وقت ہماری گفتگو خالص دینی و مذہبی کشمکش تک محدود ہے (قومی و سیاسی کشمکش کے بارے میں ہم نے ۱۹۶۷ء میں ان ہی صفحات میں تفصیل کے ساتھ اظہارِ رائے کیا تھا۔ یہ مضامین ان شاء اللہ جلد ہی کتابی صورت میں شائع کر دیئے جائیں گے!) ——— مزید برآں یہ چومکھی جنگ مسلمانوں کو بیک وقت دو دشمنوں سے لڑنی پڑی، انگریزوں سے بھی اور ہندوؤں سے بھی! اور جیسا کہ بالعموم ہوتا ہے اس میں اولاً مسلمانوں کو مدافعت ہی پر اکتفا کرتے بنی اور ایک طویل عرصے بعد ہی یہ صورت پیدا ہوسکی کہ قدم جما کر کسی مثبت اساس پر تعمیرِ جدید کی کوشش شروع کرسکیں۔

خالص مذہبی میدان میں مسلمانوں کو سب سے پہلے عیسائی مشنریوں کی یلغار سے سابقہ پیش آیا۔ ۱۸۲۶ء میں ہیبر (HABER) لارڈ بشپ آف کلکتہ نے براستہ دہلی بمبئی تک پورے

ہندوستان کا دورہ کرنے کے بعد اعلان کیا کہ ہم نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے کہ مسلمانانِ ہند میں نہ کوئی مذہبی جذبہ باقی رہا ہے نہ سیاسی قوّت۔ لہٰذا عیسائیوں کو کھل کر اپنے مذہب کی تبلیغ کرنی چاہیے۔ چنانچہ عیسائی پادری چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے اور نوبت باینجا رسید کہ جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر بھی عیسائیت کی تبلیغ ہونے لگی۔ تب وہی سُنّتِ الٰہی ظاہر ہوئی کہ ؎

خونِ اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری!

اور یہ سعادت اُسی خطّے کے حِصّے میں آئی جس میں علم و حکمتِ ولی اللّٰہی کے چشمے بہہ رہے تھے کہ ضلع مظفر نگر کے قصبے کیرانہ سے مولانا رحمت اللہ نامی شخصیّت اُبھری جس نے پادری فینڈر (FANDER) کی کتاب "میزان الحق" کا دندان شکن اور مُسکت جواب "اظہار الحق" کے نام سے تحریر کیا۔ نتیجتہً پادری صاحب موصوف کو ہندوستان سے دُم دبا کر بھاگتے ہی بنی ——— (اور پھر جب اس نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز ترکی کو بنایا اور وہاں کے علماء کا ناک میں دم کر دیا اور وہاں سے طلبی پر مولانا رحمت اللہ کیرانوی ترکی پہنچے تو وہاں سے بھی نو دو گیارہ ہو گیا) مباحثے اور مناظرے میں اِس شکستِ فاش کا نتیجہ یہ نکلا کہ بعد میں ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ کھلے میدان میں خم ٹھونک کر کبھی نہ کی جا سکی۔ اور اس کی واحد ممکن صورت صرف یہ رہ گئی کہ پسماندہ طبقات کی تالیفِ قلب کے ذریعے کچھ لوگوں کے ناموں کے آگے چُپکے سے 'مسیح' کا لاحقہ چسپاں کرا دو! بس!

دوسری طرف عیسائی پادریوں کے دیکھا دیکھی ہندوؤں کی باسی کڑھی میں بھی اُبال آ گیا اور مسلمانوں پر اُن کا تبلیغی حملہ دو صورتوں میں ہوا: ایک خالص رجعتی اور تنگ نظرانہ انداز میں، دوسرے قدرے وسیع المشربی کے رنگ اور ترقی پسندانہ انداز میں ——— ان میں سے پہلے کا حشر تو اگرچہ عیسائی مشنریوں کے انجام جیسا ہی ہوا لیکن جس طرح کوئی بخار جاتے جاتے مریض کے لیے کوئی اذیت بخش چیز چھوڑ جاتا ہے جسے عام گھریلو زبان میں بخار کا "مُوتنا" کہتے ہیں اِسی طرح یہ فتنہ بھی جاتے جاتے جسدِ ملّت میں ایک سرطان کی جڑیں جما گیا ——— رہا دوسرے انداز کا حملہ تو اُس نے میٹھی چھُری والا کام کیا اور مسلمانانِ ہند کے اچھے بھلے حصّے کو متأثر کیا یہاں تک کہ بعض انتہائی اہم شخصیتیں بھی اس کی زُلفِ گرہ گیر کی اسیر ہو گئیں۔

اوّل الذکر حملہ ـــــ آریہ سماجیوں کی جانب سے تھا جنہوں نے ۱۸۶۵ء ہی کے لگ بھگ مسلمانوں کو للکارنا شروع کر دیا تھا اور ۱۸۷۵ء میں سوامی دیانند سرسوتی کی تصنیف "ستھیارتھ پرکاش" کی اشاعت سے تو گویا یہ فتنہ عروج کو پہنچ گیا تھا۔ اِن کے جواب کے لیے علماءِ حق بھی میدان میں آئے لیکن بدقسمتی سے اس میدان میں نمایاں حیثیّت آنجہانی غلام احمد قادیانی کو حاصل ہو گئی جس نے ۱۸۸۳ء میں اپنی تالیف "سرمہ چشم آریہ" ہی کے ذریعے وہ ہر دلعزیزی حاصل کی تھی جو اس کے ظرف سے بہت زیادہ ہونے کے باعث چھلک پڑی۔ نتیجتہً وہ خود بھی گمراہ ہوا اور دوسرے سینکڑوں اور ہزاروں کو بھی گمراہ کر گیا۔

مؤخّر الذکر حملہ ـــــ برہمو سماج کی صورت میں سامنے آیا جس کی تأسیس ۱۸۱۶ء میں راجہ رام موہن رائے (ولادت ۱۷۷۰ء، وفات ۱۸۳۳ء) نے کی تھی۔ عجیب بات ہے کہ یہ انتہائی ذہین و فطین اور عالم و فاضل شخص بھی پہلے اسلام اور مسلمانوں کی جانب سے مدافعت کرتے ہوئے ہی سامنے آیا۔ چنانچہ اس نے مسلمانوں کو عیسائی مشنریوں کے حملے سے بچانے کے لیے "تحفۃ الموحدین" تصنیف کی اور اس طرح مسلمانوں میں ہر دلعزیزی حاصل کر لی۔ بعد میں یہ شخص اپنشدوں کا پرچارک، ہندوستان کی عظمت و سطوتِ پارینہ کا نقیب اور ہندی نیشنلزم کا علمبردار بن کر سامنے آیا۔ اور مسلمانانِ ہند کے دلوں میں نرم گوشہ پیدا کرنے کے لیے اس نے اکبرِ اعظم علیہ ما علیہ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے 'دینِ الٰہی' کے چربے کے طور پر 'وحدتِ ادیان' کا فلسفہ ایجاد کیا۔ جس کے ناوک نے اچھے اچھوں کو زخمی کیا اور بڑے بڑوں کے دلوں کو چھید ڈالا۔ واقعہ یہ ہے کہ انڈین نیشنل کانگرس کی پوری تحریک اسی ایک شخص کے ظلّ اور بروز کی حیثیّت رکھتی ہے اور گاندھی جی کی شخصیّت پر سب سے گہری چھاپ اسی کی نظر آتی ہے۔ عجیب مماثلت ہے کہ جس طرح راجہ جی نے اسلام اور مسلمانوں کی مدافعت میں "تحفۃ الموحدین" تالیف کی اسی طرح گاندھی جی نے مسلمانوں کی تالیفِ قلب کے لیے تحریکِ خلافت میں شمولیّت اختیار کی اور وحدتِ ادیان کے فلسفے کو اتنا اُچھالا کہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم جیسی عظیم اور نابغہ شخصیّت بھی اس کی زلفِ گرہ گیر کی اسیر ہو گئی ؎

"ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں"!

مسلمانانِ ہند کی مثبت احیائی مساعی کا آغاز دراصل بیسویں صدی عیسوی کی ابتدا سے ہوا۔

یہ مساعی قومی و ملی سطح پر اور خالص سیاسی میدان میں بھی ہوئیں اور علمی و فکری سطح پر بھی۔ ہم مختلف مواقع پر اس احیائی عمل کے مختلف پہلوؤں پر اظہارِ رائے کر چکے ہیں۔ آج ہمیں اس ہمہ جہتی عمل کے اُس پہلو پر روشنی ڈالنی ہے جو ہمارے نزدیک خالص تجدید و احیائے دین اور بٹھیڑ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے اعتبار سے اہم ترین ہے ——— اور وہ یہ کہ بحمداللہ نگاہوں کا ارتکاز رفتہ رفتہ قرآن مجید پر ہوتا جا رہا ہے اور اُمّتِ مسلمہ جو کلام اللہ سے بالکل بیگانہ ہو گئی تھی دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہو رہی ہے

اس عمل کا آغاز جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، اٹھارویں صدی میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے قرآن مجید کے فارسی ترجمے اور "الفوز الکبیر فی اُصول التفسیر" کی تالیف سے کیا۔ انیسویں صدی کے آغاز میں اُن کے دو صاحبزادوں، شاہ رفیع الدینؒ اور شاہ عبدالقادرؒ کے علی الترتیب لفظی و بامحاورہ اردو ترجمے شائع ہوئے (شاہ رفیع الدینؒ کا ۱۸۰۵ء میں اور شاہ عبدالقادرؒ کا ۱۸۱۰ء میں)۔ ——— انیسویں صدی کا اکثر حصّہ اگرچہ سیاسی شکست و ریخت اور عیسائیوں اور آریہ سماجیوں کے ساتھ مباحثوں اور مناظروں میں بیت گیا تاہم اس کے اواخر ہی میں "رُجُوع اِلَی القرآن" کا وہ عمل پھر شروع ہو گیا تھا جو بیسویں صدی کے اوائل میں پوری شدّت کو پہنچا۔

رُجُوع اِلَی القرآن کے اِس عمل کا جائزہ لیتے ہوئے یہ امر پیشِ نظر رہنا ضروری ہے کہ آغازِ کار میں اس میں اُن گروہوں نے بھی حصّہ لیا جو بعد میں انتہائی غلط راہوں پر چل نکلے اور ضَلُّوا وَ اَضَلُّوا کا مصداقِ کامل بن گئے۔ ان میں وہ بھی ہیں جو "ضَلُّوا ضَلٰلًا بَعِیْدًا" کی اُس حد کو پہنچ گئے کہ اُمّت کو مجبوراً ان کا تعلّق اپنے سے منقطع کرنا پڑا جیسے قادیانی، اور وہ بھی ہیں جن کی یا تو گمراہی اس درجے کی نہ تھی یا اہمیّت اتنی نہ تھی کہ یہ انتہائی قدم اٹھایا جاتا جیسے چکڑالوی و پرویزی ——— تاہم چونکہ انہوں نے بھی قرآن حکیم کی جانب ارتکازِ توجّہ کے عمل میں صحیح یا غلط طور پر کچھ حصّہ لیا ہے لہٰذا اُن کا ذکر کیا جا رہا ہے ——— اِسے کسی بھی درجے میں ان کی تائید کے مترادف نہ سمجھا جائے۔

سب سے پہلے تو اندازہ کرنا چاہیے کہ گزشتہ صدی کے ربعِ آخر اور موجودہ صدی کے ربعِ اوّل میں ترجمہ و تفسیرِ قرآن کے ذیل میں برّصغیر پاک و ہند میں کس قدر کام ہوا:

(۱) سب سے پہلے سرسیّد احمد خاں مرحوم نے ۱۸۷۵ء میں اپنے ہفت روزہ اخبار 'تہذیبُ الاخلاق' میں تفسیرِ قرآن کا سلسلہ شروع کیا جو گیارہ سال میں پندرہ پاروں تک پہنچ کر رُک گیا۔

(۲) ۱۹۰۳ء میں ڈپٹی نذیر احمد صاحب کا ترجمہ شائع ہوا۔

(۳) ۱۹۰۶ء میں مرزا حیرت دہلوی کا ترجمہ شائع ہوا۔

(۴) ۱۹۱۰ء میں مولوی فتح محمد جالندھری کا ترجمہ شائع ہوا۔

(۵) ۱۹۰۵ء میں مولوی عبداللہ چکڑالوی کی تفسیر شائع ہوئی۔

(۶) ۱۹۱۱ء میں مرزا ابوالفضل ایرانی (شیعہ) نے انگریزی میں ترجمہ شائع کیا۔ اس کو دیکھ کر نواب عماد الملک بلگرامی نے اس سے بہتر ترجمہ شروع کیا لیکن سولہ پاروں تک ہی پہنچ پائے تھے کہ فوت ہوگئے۔ لہٰذا یہ نامکمل رہ گیا اور شائع نہ ہوسکا۔

(۷) ۱۹۰۶ء میں مولانا اشرف علی تھانویؒ نے تفسیر بیان القرآن لکھنی شروع کی جو ۱۹۱۵ء میں مکمل ہوئی۔

(۸) ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ دیوبندی کا ترجمہ مع مختصر حواشی شائع ہوا (حواشی سورۂ نساء تک حضرت شیخ الہندؒ کے ہیں اور باقی مولانا شبیّر احمد عثمانیؒ کے)

(۹) ۱۹۱۷ء میں محمد علی لاہوری کا انگریزی ترجمۂ قرآن مع مختصر حواشی شائع ہوا (اسے اس قدر شہرت حاصل ہوئی کہ ۱۹۲۰ء تک کُل تین برس میں اس کے تیس ہزار نسخے فروخت ہوگئے!)

(۱۰) ۱۹۲۲ء میں محمد علی لاہوری ہی کی اُردو تفسیر شائع ہوئی، اس کا نام بھی 'بیان القرآن' ہی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ فہرست کسی طرح بھی مکمّل نہیں کہلا سکتی، تاہم اس سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ قرآن مجید کے ساتھ اعتناء و التفات کا ایک سلسلہ گذشتہ صدی کے اواخر سے شروع ہوگیا تھا اور اس صدی کے رُبعِ اوّل کے ختم ہونے تک خاصی دلچسپی مسلمانانِ ہند کو قرآنِ حکیم اور اس کے عُلوم و معارف کے ساتھ پیدا ہوچکی تھی۔

ہم اس سے قبل ایک موقع پر قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں کہ برّصغیر پاک و ہند میں ملّتِ اسلامی کی نشاۃِ ثانیہ کے عمل کے دوران دو متضاد نقطۂ نظر اور طرزہائے فکر پروان چڑھتے گئے۔ ایک وہ جس کا منبع و سرچشمہ علی گڑھ بنا اور دوسرے وہ جس کے مرکز و محور کی حیثیت دیوبند کو حاصل ہوئی۔ ابتداء میں راسخ العقیدہ علماء کی گرفت مسلم معاشرے پر اتنی مضبوط تھی کہ علی گڑھی طرزِ فکر کو اپنے لیئے راستہ بنانے میں شدید مخالفت و مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا لیکن بعد میں حالات کے تقاضوں کے تحت اُس کے اثرات وسیع سے وسیع تر ہوتے چلے گئے اور علماء کا حلقۂ اثر سکڑتا چلا گیا۔ تاہم اب بھی ہمارے جسدِ ملّی کے بحرِ محیط میں یہ دونوں رَوّیں بالکل مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ۝ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ۝ کی سی شان کے ساتھ بہہ رہی ہیں۔ اور اگرچہ قومی و سیاسی میدان میں علی گڑھی مکتبِ فکر کو فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی تاہم مذہبی میدان میں اب بھی غلبہ و اقتدار راسخ العقیدہ علماء ہی کو حاصل ہے!

اس تفرقہ و اختلاف کے جو اثرات ہماری قومی و سیاسی جدّوجُہد پر مترتّب ہوئے وہ ہماری اس وقت کی گفتگو کے موضوع سے خارج ہیں۔ اس وقت صرف یہ عرض کرنا ہے کہ قرآن حکیم کی جانب توجّہ و التفات کا جو رُجحان پیدا ہوا اُس میں بھی یہ دونوں رنگ بالکل علیٰحدہ علیٰحدہ نظر آتے ہیں۔ چنانچہ متذکرہ بالا تراجم و تفاسیر کو بنیادی طور پر دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک متجدّدانہ رنگ کی حامل تفاسیر جن کے ضمن میں سرسیّد احمد خاں مرحوم کی تفسیر کو اصلُ الاصُول کی حیثیّت حاصل ہے اور دوسری روایتی انداز کی راسخ العقیدہ تفاسیر جن میں حضرت شیخ الہندؒ کا ترجمہ اور مولانا تھانویؒ کی تفسیر بنیادی اور اساسی اہمیّت کی حامل ہیں۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے تراجم و تفاسیر یا بالفاظِ دیگر "فکرِ قرآنی" کے میدان میں خواہ مولوی عبد اللہ چکڑالوی کی چکڑالویّت ہو خواہ محمّد علی لاہوری کی لاہوریّت، اور خواہ علاّمہ عنایت اللہ خاں المشرقی کی مشرقیّت ہو خواہ چودھری غلام احمد پرویز کی پرویزیّت، یہ سب فکرِ سرسیّد ہی کی شاخیں ہیں اور دوسری طرف مولانا تھانویؒ کی "بیان القرآن" پر مبنی تین مزید تفسیریں منصّۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ ایک مولانا عبد الماجد دریابادی کی تفسیر جس میں تقابلِ ادیان اور خصوصاً بائبل ہسٹری کے ضمن میں بہت مفید مباحث ہیں، دوسری مولانا محمّد ادریسؒ کاندھلوی کی تفسیر جس میں کلامی مسائل پر زیادہ

توجہ کی گئی ہے اور تیسری مولانا مفتی محمد شفیعؒ کی تفسیر جس میں فقہی مسائل سے زیادہ اعتنا کیا گیا ہے

جہاں تک مقدم الذکر مکاتب فکر کا تعلق ہے، ہمیں ان سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے اور ہم انہیں ضلالت و گمراہی ہی کے مختلف رنگ (SHADES) سمجھتے ہیں۔ بایں ہمہ اس جائزے میں اُن کا ذکر دو وجوہ سے کیا گیا ہے: ایک یہ کہ اُن کی مساعی سے بھی اُمّت کے بعض عناصر میں قرآن مجید سے ایک دلچسپی پیدا ہوئی۔ اور اگرچہ اُن کے زیر اثر یہ دلچسپی غلط رُخ پر پڑ گئی، تاہم اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اگر قرآن حکیم کے حقیقی اور اصلی عُلوم و معارف پیش کیے جائیں تو ان مکاتب فکر سے منسلک لوگوں کو بآسانی راغب کیا جا سکتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ ان مکاتب فکر نے گویا ایک 'دعویٰ' (THESIS) کی شکل اختیار کر لی جس کے جواب دعویٰ (ANTI-THESIS) کے طور پر راسخ العقیدہ علماء کو ترجمہ و تفسیر قرآن کی جانب متوجہ ہونا پڑا اور اس طرح ایک بڑا ذخیرہ اُردو تراجم و تفاسیر کا تیار ہو گیا۔ جس سے قرآن مجید کی جانب عوام کی توجہات کے انعطاف کا عمل تیز تر ہو گیا۔

ویسے یہ عرض کرنا غالباً خارج از محل شمار نہیں ہو گا کہ خود علماء کے حلقوں میں تا حال قرآن حکیم پر توجہ اس درجہ مرکوز نہیں ہوئی جتنی ہونی چاہیئے تھی۔ راقم الحروف نے ایک بار مولانا سیّد محمد یوسف بنوری مدظلہ سے دریافت کیا کہ اس کا کیا سبب ہے کہ اصول حدیث اور اصول فقہ پر تو ہمارے یہاں ضخیم تصانیف موجود ہیں لیکن اصول تفسیر پر کل دو مختصر رسالے ملتے ہیں ایک امام ابن تیمیہؒ کا اور دوسرا شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا ہے ——— اس کا جواب تو مولانا نے قدرے توقف کے بعد یہ دیا کہ اصل میں اصول فقہ کی کتابوں میں اصول تفسیر بھی زیر بحث آ جاتے ہیں لہٰذا علیحدہ تصانیف کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن جب میں نے دریافت کیا کہ اس کا کیا سبب ہے کہ آپ کے دارالعلوم میں تخصص فی الحدیث کا شعبہ بھی ہے اور تخصص فی الفقہ کا بھی لیکن تخصص فی التفسیر کا شعبہ موجود نہیں ہے؟ تو اس پر مولانا نے پوری فراخدلی کے ساتھ تسلیم فرمایا کہ یہ ہماری کوتاہی ہے! اسی طرح حیرت ہوتی ہے کہ حلقہ دیوبند کے علماء کرام کے دلوں میں حضرت شیخ الہندؒ کا جو مقام و مرتبہ ہونا چاہیے اور فی الواقع ہے وہ اظہر من الشمس ہے لیکن اُن کی آخری نصیحتوں میں سے اہم ترین نصیحت جسے نقل فرمایا مفتی محمد شفیعؒ نے اس پر عمل کہیں نظر نہیں آتا۔ الّا ماشاء اللہ

بہر حال علی گڑھ اور دیو بند کی ان دو انتہاؤں کے مابین ملت اسلامیۂ ہند کے محیط میں 'فکرِ قرآنی' کے تین سوتے اور پھوٹے جنہیں مجموعی طور پر (SYNTHESIS) سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

(۱) ایک وہ جس کا منبع اور سرچشمہ بنے علاّمہ اقبال مرحوم جو معروف و متداول معنوں میں تو نہ مترجم قرآن تھے نہ مفسرِ قرآن۔ بلکہ اُن کی تعلیم بھی نہ کسی دار العلوم میں ہوئی تھی، نہ جامعۂ اسلامیہ میں۔ اس کے برعکس وہ سکولوں اور کالجوں کے تعلیم یافتہ اور یورپی یونیورسٹیوں کے فیض یافتہ تھے۔ بایں ہمہ قرآن حکیم کی ترجمانی کے اعتبار سے اُن کا مقام یقیناً 'رومیِ ثانی' کا ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے پورے اعتماد کے ساتھ مناجات بحضور سید المرسلین صلعم میں یہ تک کہہ دیا کہ:

گر دلم آئینۂ بے جوہر است ۔ ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کُن ۔ ایں خیاباں رازِ خارم پاک کُن
روزِ محشر خوار و رُسوا کُن مرا ۔ بے نصیب از بوسۂ پا کُن مرا

چنانچہ اُن کے اشعار تو ایمان ویقین کے کیف و سُرور، محبّتِ الٰہی اور عشقِ رسُول صلعم کے سوز و گداز اور جذبہ و جوشِ عمل سے مملو ہیں ہی، اُن کے خطبات بھی درحقیقت وقت کی اعلیٰ ترین فکری سطح پر مطالعۂ قرآن حکیم ہی کی ایک کوشش کا مظہر ہیں جس کے ذریعے علاّمہ مرحوم نے جدید ریاضیات وطبعیات اور فلسفہ ونفسیات کا رشتہ قرآن حکیم کی اساسی تعلیمات کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے بغیر دورِ حاضر میں دین ومذہب کی گاڑی کا آگے چلنا محالِ مطلق ہے۔

علاّمہ مرحوم کی اس فکری کاوش کے ضمن میں اُن کے معروف ہم نشینوں نے تو کوئی مزید کام نہیں کیا ــــ البتہ ڈاکٹر رفیع الدّین مرحوم نے اس سلسلے میں خاصی وقیع خدمات سرانجام دیں۔ چنانچہ انہوں نے ایک طرف 'قرآن اور علمِ جدید' نامی تالیف کے ذریعے بعض جدید اور اہم نظریوں اور فلسفوں جیسے ڈارون کا نظریۂ ارتقاء، فرائڈ کا نظریۂ جنس، مارکس کا نظریۂ جدلی مادیت وغیرہ کا جائزہ قرآن حکیم کی روشنی میں لیا اور ان کے صحیح اور غلط اجزاء کی نشاندہی کی کوشش کی اور دوسری طرف "IDEOLOGY OF THE FUTURE" نامی تصنیف کے ذریعے علاّمہ مرحوم کے فلسفۂ خودی کو ایک مرتّب اور منظّم نظامِ فکر کی حیثیت سے واضح کیا اور ثابت کیا کہ نوعِ انسانی

کا مستقبل اسی نظریے کے ساتھ وابستہ ہے۔

(۲) برصغیر میں قرآنی فکر کا دوسرا دھارا مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی شخصیت سے پھوٹا جس پر فکر سے زیادہ دعوت کا رنگ غالب تھا۔ مولانا مرحوم مفسرِ قرآن کی حیثیت سے تو بہت بعد میں متعارف ہوئے اس لیے کہ 'ترجمان القرآن' کی جلد اوّل ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ شائع ہوئی تاہم اُن کی قرآن حکیم کی ترجمانی اور قیامِ حکومتِ الٰہیہ کے لیے دعوتِ جہاد کا ڈنکا برصغیر کے طول و عرض میں ۱۹۱۲ء تا ۱۹۱۶ء 'الہلال' اور 'البلاغ' کے ذریعے بج چکا تھا۔ اور اس ضمن میں وہ حضرت شیخ الہندؒ ایسی عظیم شخصیت تک سے خراجِ تحسین وصول کر چکے تھے۔ افسوس ہے کہ ۱۹۲۰ء، ۱۹۲۱ء میں جب بعض علماء کی مخالفت کے باعث مولانا مرحوم امام الہند کے منصب پر فائز ہوتے ہوتے رہ گئے تو ایک شدید ردِّ عمل اُن کی طبیعت میں پیدا ہوا اور وہ

"یہ صور پھونک کر تم سو گئے کہاں آخر؟"

کے مصداق اس راہ ہی کو تج کر انڈین نیشنل کانگرس کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر رہ گئے اور اس طرح کم از کم عارضی طور پر برصغیر میں قرآنی فکر کے اس دھارے کے سوتے خشک ہو گئے! (مزید افسوسناک امر یہ کہ گاندھی جی کی شخصیت کے زیر اثر مولانا مرحوم 'وحدتِ ادیان' کے بھی پرچارک بن گئے۔ اور اس طرح گویا 'برہمو سماج' کی تقویت کا ذریعہ بن گئے!)

تاہم 'الہلال' اور 'البلاغ' کی دعوت اتنی بودی اور بے جان نہ تھی کہ اس طرح ختم ہو جاتی۔ چنانچہ اس نے فوراً ہی ایک دوسری فعّال شخصیت کی صورت میں ظہور کر لیا جس نے اولاً مولانا آزاد مرحوم کے نعرۂ جہاد کو ایک مبسوط تصنیف کا موضوع بنایا اور 'الجہاد فی الاسلام' ایسی معرکۃ الآرا کتاب بالکل نوعمری میں لکھ ڈالی اور پھر ۱۹۳۲ء سے مولانا آزاد کی تفسیر 'ترجمان القرآن' کے ہم نام ماہنامے کے ذریعے قرآن حکیم کی ترجمانی اور خاص طور پر اس کی انقلابی دعوت کے تسلسل کو باقی رکھا۔ یہ ہیں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی جنہوں نے ایک طرف 'قیامِ حکومتِ الٰہیہ' کے نصب العین کے پیشِ نظر ۱۹۴۱ء میں 'جماعتِ اسلامی' قائم کی اور دوسری طرف 'تفہیم القرآن' کے ذریعے قرآن مجید کی تعلیمات اور خصوصاً اُس کی انقلابی دعوت کا تعارف برصغیر کے طول و عرض میں بالخصوص جدید تعلیم یافتہ نسل کے ایک بہت بڑے حلقے میں کرا دیا ——— اور اگرچہ

اس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے کہ اپنے پیشرو کی طرح جو ایک وقتی سی رکاوٹ سے بددل ہو کر کانٹا ہی بدل گیا تھا، مولانا مودودی بھی قیامِ پاکستان کے وقت کچھ فوری سی توقعات اور وقتی سے امکانات سے دھوکہ کھا کر پاکستانی سیاست کے گرداب میں کود پڑے۔ اور پورے تیس برس ہونے کو آئے کہ وہ پوری جماعت سمیت اسی صحرائے تیہہ میں سرگرداں ہیں (اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ چالیس سال پورے کر کے بھی انہیں یا اُن کی جماعت کو اس صحرا نوردی سے نجات ملے گی یا نہیں؟) ——— اور اس پر بھی جتنا افسوس کیا جائے کم ہے کہ عمر کے آخری مرحلے میں 'خلافت اور ملوکیت' نامی تالیف کے ذریعے مولانا مودودی رفض اور تشیّع کی تقویت کا موجب بن گئے، تاہم اُن کی خدمات بالکل رائیگاں جانے والی نہیں ہیں۔ انہوں نے بلا مبالغہ لاکھوں انسانوں کے دلوں میں اسلام کے غلبے کی آرزو پیدا کی ہے اور ہزاروں کو اس جدّوجہد میں عملاً مبتلا کیا ہے۔ اور اگرچہ ایک غلط فیصلے اور اس پر بیجا اصرار نے اُن کی چالیس سالہ مساعی کو غلط رُخ پر ڈال کر رکھ دیا ہے، تاہم قرآن کی انقلابی دعوت کا جو صُور انہوں نے پھونکا ہے وہ یقیناً بہت سے دلوں کو گرماتا رہے گا اور کیا عجب کہ ابوالکلام آزاد مرحوم ثمّ ابوالاعلیٰ مودودی کی یہ دعوتِ جہاد پھر کسی گوشے سے نئی آب و تاب اور تازہ جوش و خروش کے ساتھ اُبھرے۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيزٍ!

(۳) وہ عظیم شخصیت جس سے برِّصغیر میں دیوبند اور علی گڑھ کے مابین قرآنی فکر کا تیسرا سوتا پھوٹا، مولانا حمید الدّین فراہیؒ کی ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ قدیم اور جدید کا حسین ترین امتزاج اُن ہی کی ذات میں ہوا[1]۔ انہوں نے بیس سال ہی کی عمر میں اُس دور کے چوٹی کے علماء سے فارسی، عربی اور دینی علوم کی تحصیل مکمل کر لی تھی۔ اس کے بعد وہ علی گڑھ کے ماحول میں رہے اور وہاں انہوں نے انگریزی زبان اور فکرِ جدید کا مطالعہ براہِ راست کیا۔ اور پھر اُن کی نگاہیں قرآن حکیم پر مرتکز ہو گئیں۔ اور انہوں نے باقی پوری زندگی 'حکمتِ قرآنی' کی گہرائیوں میں غوطے لگانے

---

[1] چنانچہ امام فراہیؒ کی وفات پر جو تعزیتی مضمون مولانا سیّد سلیمان ندویؒ نے ماہنامہ معارف شمارہ ۱، ۲ جلد ۲۷ بابت جنوری و فروری ۱۹۳۱ء میں مولانا فراہیؒ ہی کے اس شعر کو عنوان بنا کر لکھا تھا کہ:

فغاں کہ گشت نیوشندۂ سخن خاموش   دگر چگونہ تسلّی کنم من ایں لب وگوش

(بقیّہ اگلے صفحہ پر)

میں بسر کردی۔ اور اگرچہ اُن کا مزاج "کاتا اور لے دوڑی" کے بالکل برعکس "نیکی کر دریا میں ڈال" والا تھا۔ چنانچہ اپنی زندگی میں مفسّر یا مُصنّف و مؤلّف کی حیثیت سے شہرت پانے کی کوئی کوشش انہوں نے نہیں کی بلکہ جو کچھ لکھا اُسے حوالۂ صندوق کرتے چلے گئے۔ تاہم اُن کی جو چند مختصر چیزیں اُن کی زندگی ہی میں شائع ہوئیں، انہوں نے اُن کے "تدبّرِ قرآن" کا لوہا وقت کے چوٹی کے علماء و فضلاء سے منوا لیا۔ اور اُن کی مساعی کا اصل حاصل یہ برآمد ہوا کہ "تدبّرِ قرآن" کا صحیح نہج واضح ہو گیا اور قرآنِ حکیم کے معدنِ علم و حکمت سے معرفت کے ہیرے جواہرات نکالنے کا صحیح طریق معیّن ہو گیا۔

مولانا فراہیؒ پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل و احسان یہ ہوا کہ انہیں ایسے شاگرد بھی میسّر آ گئے جنہیں اُنہوں نے اپنے طرز پر غور و فکر کی تربیت خود دے کر تیار کر دیا تاکہ وہ اُن کے بعد ان کی روشن کی ہوئی راہ پر آگے بڑھ سکیں۔ اُن کے اِن تلامذہ میں سب سے نمایاں مقام تو حاصل ہے مولانا امین احسن اصلاحی کو جنہوں نے نہ صرف یہ کہ حقیقتِ شرک، حقیقتِ توحید، حقیقتِ تقویٰ اور حقیقتِ نماز ایسی گرانمایہ تصانیف کے ذریعے خالص قرآنی علم کلام کی تدوین کی راہ کھول

(حاشیہ صفحہ گذشتہ)

اس کے مندرجہ ذیل ابتدائی الفاظ قابلِ توجہ ہیں: "اس سے پہلے ہندوستان کے جن اکابر علماء کا ماتم کیا گیا ہے، وہ کُل وہ تھے جن کی ولادت اور نشو و نما انقلابِ زمانہ سے پہلے ہوئی تھی، آج سب سے پہلی دفعہ ہم نئے عہد کے سب سے پہلے عالم کی وفات کے ماتم میں مصروف ہیں، ہم ایک ایسے گریجویٹ عالم کا ماتم کرتے ہیں جو اپنے علم و فضل، زہد و ورع اور اخلاق و فضائل میں قدیم تہذیب کا نمونہ تھا، لیکن جو اپنی روشن خیالی، جدید علوم و فنون کی اطلاع و واقفیت اور مقتضیاتِ زمانہ کے علم و فہم میں عہدِ حاضر کی سب سے بہتر مثال تھا۔ اس سے پہلے ان تمام علماء نے جو نئے علمِ کلام کا اپنے کو بانی کہتے اور سمجھتے ہیں، جو کچھ کہا اور لکھا، وہ دوسروں سے سُنی سنائی باتیں تھیں لیکن اس جماعت میں یہ پہلی ہستی تھی، جس نے فلسفۂ حال کے متعلق نفیاً یا اثباتاً جو کچھ کہا اور لکھا وہ اپنی ذاتی تحقیق اور ذاتی علم و مطالعہ سے آج ہمارے سامنے ایسے متعدد علماء کی مثالیں ہیں جنہوں نے عربی علوم کی تکمیل کے بعد انگریزی پڑھنی شروع کی اور بی۔ اے اور ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی سندیں حاصل کیں، لیکن اس طرح کہ ع

"جو پڑھا لکھا تھا نیاز نے اُسے صاف دل سے بھلا دیا"

نئے رنگ نے پرانے رنگ کو اتنا پھیکا کر دیا کہ ان پر اس کا نشان بھی نظر نہیں آتا، لیکن آج ہم جس ہستی کا تذکرہ کر رہے ہیں اس کا حال یہ تھا کہ اس نئے رنگ کی شوخی سے اس کے پرانے رنگ کا گہرا پن اور بڑھ گیا تھا اور اس کو دیکھ کر یہ سمجھنا بھی مشکل تھا کہ یہ علی گڑھ کالج اور الٰہ آباد یونیورسٹی کا گریجویٹ ہے، بلکہ سچ یہ ہے کہ اس کی سادگی کو دیکھ کر عوام بظاہر اس کو عالم بھی مشکل ہی باور کر سکتے تھے مگر وہ وہ تھے جو اپنے زمانہ میں کوئی نہیں

دی (مولانا کی یہ چاروں تصانیف اب یکجا 'حقیقتِ دین' کے نام سے مطبوعہ موجود ہیں) بلکہ خواہ عمر کے آخری حصّے میں سہی' اپنے استاذ کے اُصول پر باقاعدہ تفسیر 'تدبّرِ قرآن' بھی تحریر کردی (جواب بحمد اللہ تکمیل کو پہنچنے ہی والی ہے) اور دوسرے نمبر پر ہیں مولانا صدر الدّین اصلاحی جو بھارت ہی میں مقیم ہیں۔

بے لگام اور مادر پدر آزاد متجدّدین اور روایت پرست و قدامت پسند علماء کے بَین بَین 'فکرِ قرآنی' کے یہ تین دھارے جو برّصغیر پاک و ہند کے محیطِ علمی میں بہہ رہے ہیں بظاہر ایک دوسرے سے بہت مختلف ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے لیے جذب و انجذاب کا شدید میلان رکھتے ہیں۔

اِن میں سے مؤخّر الذکر دو دھارے تو درحقیقت پھُوٹے ہی ایک عظیم اور گھمبیر شخصیّت سے ہیں جس نے دیوبند اور علی گڑھ کے مابین ایک درمیانی راہ نکالنے کی غرض ہی سے ندوۃ العلماءٴ لکھنؤ میں ڈیرہ لگایا تھا۔ ہماری مراد علّامہ شبلی نعمانی مرحوم سے ہے جنہیں مولانا فراہیؒ اور مولانا آزاد مرحوم دونوں کے مُربّی کی حیثیت حاصل ہے ——— ہم نے اب سے لگ بھگ آٹھ سال قبل ایک مفصّل مضمون ان ہی صفحات میں تحریر کیا تھا جس میں علّامہ شبلیؒ، مولانا فراہیؒ اور مولانا آزاد مرحوم کے ذاتی میلانات اور علمی و فکری رُجحانات کا جائزہ لیا گیا تھا جس کی تصویب مولانا عبد الماجد دریا بادی نے، جنہیں بلاشبہ اس قافلے کے آخری مسافر کی حیثیّت حاصل ہے' ان الفاظ میں کی تھی:۔

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حیرت ہوگئی، شبلی، فراہی، ابوالکلام تینوں کی یہ نبّاضی بُعدِ زمانی اور بُعدِ مکانی دونوں کے باوجود اتنی صحیح کیوں کر کرلی! ؎ درحیرتم کہ بادہ فروش از کجا شُنید!"

اس تحریر کا حسبِ ذیل اقتباس طوالت کے باوصف، ان شاء اللہ، قارئین پر گراں نہ گذرے گا۔

"مولانا شبلیؒ اپنی ذات میں ایک نہایت جامع الصّفات انسان تھے اور ان کی شخصیّت ندوہ کی نسبت بہت زیادہ جامع اور گھمبیر تھی۔ چنانچہ وہ بیک وقت علم و فضل، فلسفہ و کلام، شعر و ادب اور ملّی و قومی سیاست حتّی کہ رندی اور رنگینی سب کے جامع تھے۔ اُن کے اصل جانشین

سید سلیمان ندوی، مرحوم کی شخصیت میں مولانا شبلی کی ہمہ گیر شخصیت کے صرف چند ہی پہلوؤں کا تسلسل قائم رہ سکا۔ لیکن ان کے زیر اثر دو اور ہستیاں ایسی پروان چڑھیں جو اُن کی بعض صفات کی وارث بنیں اور جن میں مولانا شبلی کی شخصیت کے بعض دوسرے پہلو اُجاگر ہوئے۔ ہماری مراد مولانا حمید الدین فراہیؒ اور مولانا ابوالکلام آزاد سے ہے۔ یہ دونوں حضرات براہِ راست تو ندوی نہیں لیکن ان کی تربیت میں مولانا کا بڑا حصہ ہے ——— اور چونکہ برصغیر کی حالیہ مذہبی فکر کے میدان میں علی گڑھ اور دیوبند کی دو انتہاؤں کے مابین دو اہم علمی و فکری سوتے اِن ہستیوں کی بدولت پھوٹے ہیں لہٰذا ان کا کسی قدر تفصیلی تذکرہ ضروری ہے۔ مولانا فراہیؒ اور مولانا آزاد مرحوم میں متعدد امور بطورِ قدرِ مشترک بھی ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ دونوں کی تربیت میں مولانا شبلی کا حصہ تھا۔ دوسرے یہ کہ دونوں کو قرآن حکیم سے خاص شغف تھا تیسرے یہ کہ دونوں اپنے وقت کے انتہائی وضع دار انسان تھے۔ چوتھے یہ کہ دونوں (مولانا شبلیؒ کے بالکل برعکس ——— جنہوں نے اپنی 'حنفیت' کی شدت کے اظہار کے لیے 'نعمانی' کی نسبت کو اپنے نام کا مستقل جزو بنا لیا تھا) تقلید سے یکساں بعید و بیزار تھے اور دونوں کو اصلی ذہنی و علمی مناسبت امام ابن تیمیہؒ سے تھی لیکن ان اشتراکات کے بعد اختلافات کا ایک وسیع میدان ہے جس میں یہ دونوں شخصیتیں ایک دوسرے کی بالکل ضد تھیں۔ مولانا آزاد میں شبلی کی رندی و رنگینی کا تسلسل بھی موجود رہا جب کہ مولانا فراہیؒ بالکل زاہد خشک تھے۔ مولانا آزاد کی وضع داری میں شکوہ و تمکنت کی آمیزش تھی، جبکہ مولانا فراہیؒ پر فقر و درویشی کا رنگ غالب تھا۔ مولانا آزاد 'ابوالکلام' تھے اور اُن کی شعلہ بیان خطابت میں ایک لاوا اُگلنے والے زندہ آتش فشاں کا رنگ تھا۔ جبکہ مولانا فراہیؒ نہایت کم گو تھے اور ان کا سکوت ایک ایسے خاموش آتش فشاں سے مشابہت رکھتا تھا جس کے باطن میں تو خیالات و احساسات کا لاوا جوش مارتا ہو لیکن ظاہر میں وہ بالکل ساکت و صامت ہو۔ مولانا آزاد کی تحریر میں اصل زور عربیت اور عبارت آرائی پر تھا جبکہ مولانا فراہی کی تحریر نہایت سادہ لیکن مدلل ہوتی تھی۔ مولانا آزاد سیاست کے میدان کے بھی شہسوار تھے اور دین کی وادی میں بھی اُن کا اصل مقام داعی کا تھا جبکہ مولانا فراہی سیاست سے تمام عمر کنارہ کش رہے اور دین و مذہب کے میدان میں بھی ان کا اصل مقام آخر دم تک صرف ایک طالب علم یا زیادہ سے زیادہ ایک مفکر کا رہا ——— چنانچہ مولانا آزاد طوطیٔ ہند تو تھے ہی، ایک وقت ایسا بھی گزرا جب وہ 'امام الہند' قرار پائے جبکہ مولانا فراہی سے اُن کی زندگی میں بھی اور آج تک صرف کچھ علم دوست لوگ ہی واقف ہو سکے ——— لیکن اس کے برعکس مولانا آزاد تو آندھی کی مانند اُٹھے اور بگولے کی طرح رخصت ہو گئے تا آنکہ آج وہ لوگ بھی اُن کا نام لینا تک گوارا نہیں کرتے جنہوں نے اپنی قندیل خود ان ہی کی شمع سے روشن کی جبکہ مولانا فراہی ایک مستقل طرزِ فکر، اور

مکتبِ علمی کی بنیاد رکھ گئے۔ جن کا نام لیوا ایک ادارہ "دائرۂ حمیدیہ" کے نام سے ہندوستان میں اور ایک انجمن مولانا امین احسن اصلاحی کی ذات میں پاکستان میں موجود ہے۔

قرآن مجید سے جو شغف ان دونوں بزرگوں کو تھا، مزاج کے افتاد کے فرق کی بنا پر اس کا ظہور بھی مختلف صورتوں میں ہوا۔ مولانا آزاد کی تفسیر سورۂ فاتحہ اردو ادب کا تو شاہکار (CLASSIC) ہے ہی، قرآن کے جلال و جمال کا بھی ایک حسین مرقع ہے۔ پھر سورۂ کہف کے بعض مباحث میں ان کی تحقیق و تدقیق کا تو کوئی جواب ہی نہیں۔ بایں ہمہ قرآن حکیم کا کوئی مرتب و منضبط فکر وہ پیش نہیں کر سکے جبکہ مولانا فراہیؒ نے قرآن حکیم کے استدلالی پہلو کو واضح کیا اور ایک طرف نظمِ قرآن کی اہمیت واضح کر کے تدبرِ قرآن کی نئی راہیں کھولیں اور قرآن پر غور و فکر کے اصول و قواعد از سرِ نو مرتب و مدوّن کیے اور دوسری طرف اپنی بعض تصنیفات میں (جو تا حال مسوّدات ہی کی صورت میں ہیں) خالصتہً قرآن حکیم کی روشنی میں ایک نئے علمِ کلام کی بنیاد رکھ دی۔"

قصہ مختصر ——— علامہ شبلی نعمانیؒ، امام حمید الدین فراہیؒ اور مولانا ابوالکلام آزاد کے مابین قرب و یگانگت کا یہی رشتہ تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے معنوی خلیفہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے "قیامِ حکومتِ الٰہیہ" کے نصب العین کے پیشِ نظر 'جماعتِ اسلامی' کی تاسیس کی تو ان کی دعوت پر نہ صرف یہ کہ مولانا فراہیؒ کے تمام نمایاں شاگرد بشمول مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا اختر احسن اصلاحی' اور مولانا صدر الدین اصلاحی لبیک کہتے ہوئے حاضر ہو گئے بلکہ مولانا شبلیؒ کے تلمیذِ رشید مولانا سید سلیمان ندویؒ کے دو ارشد تلامذہ یعنی مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا مسعود عالم ندویؒ بھی ——— "من نیز حاضر می شوم۔۔۔" کے مصداق بن گئے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ اس 'قرآن السعدین' سے بہت سی برکتیں ظہور میں آئیں جن کا نمایاں ترین مظہر مولانا امین احسن اصلاحی کی شاہکار تالیف 'دعوتِ دین اور اس کا طریق کار' ہے جس میں ایک جانب مولانا فراہیؒ کے قرآنی غور و فکر کا تعمق موجود ہے تو دوسری جانب مولانا آزاد مرحوم کا داعیانہ جوش و خروش بھی موجود ہے۔ اور اسی کے ذیل میں آتی ہیں مولانا صدر الدین اصلاحی کی بعض تصانیف جیسے 'فریضۂ اقامتِ دین' ——— 'حقیقتِ نفاق' ——— اور 'اساسِ دین کی تعمیر' وغیرہ۔

رہا 'فکرِ قرآنی' کا اوّل الذکر دھارا جس میں علامہ اقبال مرحوم کو تن تنہا ایک انجمن کی حیثیت حاصل ہے تو اس کا بقیہ دونوں دھاروں سے ربط و تعلق اِس واقعے سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ مولانا مودودی کو حیدر آباد دکن کی بنجر اور سنگلاخ زمین سے ہجرت کر کے پنجاب ایسے زرخیز اور سرسبز و شاداب خطّے میں اقامت گزیں ہونے کی دعوت علامہ اقبال مرحوم ہی نے دی تھی۔ اور اس سے بھی آگے یہ کہ معروف علماء کے حلقے میں علامہ مرحوم کے سب سے بڑے بلکہ غالباً صحیح تر الفاظ میں واحد شیدائی مولانا ابوالحسن علی ندوی ہی ہیں۔

مزید برآں، پنجاب میں مولانا مودودی کو جو مقبولیت حاصل ہوئی اور ان کی دعوت اور جماعت دونوں کو جو فروغ نصیب ہوا بعض دوسرے اسباب و عوامل کے ساتھ ساتھ اس کا اہم ترین سبب یہی ہے کہ یہاں علامہ اقبال مرحوم اپنے اشعار کے ذریعے گویا قلوب کی دنیا میں ہل چلا چکے تھے اور اب زمین منتظر تھی کہ کوئی آئے اور بیج ڈالے اور یہ اپنے خزانے اُگل کر رکھ دے۔ خصوصاً پنجاب کا جدید تعلیم یافتہ نوجوان تو گویا اس "دگر دانائے راز" کے لیے چشم براہ تھا جس کا ذکر بہ شدید حسرت و یاس علامہ مرحوم نے مرتے دم کیا تھا!

بقیہ : تبادلۂ خیال

سال سے زائد کا عرصہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر ابوسلمان صاحب شاہجہانپوری (مولانا آزادؒ کے خلیفۂ ثانی) نے مجھے لکھا تھا کہ اُن کو ایک اہلِ علم نے ہندوستان سے لکھا تھا کہ وہ جواہر پارے مِل گئے ہیں اور اُن کو عنقریب شائع کر دیا جائے گا۔ گذشتہ جولائی میں ڈاکٹر صاحب موصوف سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ وہ خود عنقریب ہندوستان جا رہے ہیں کہ اُن کا سُراغ لگایا جا سکے۔ اُن کی اطلاع کے مطابق وہ جواہر پارے مولانا آزادؒ کے بھانجے (؟) نورالدّین صاحب ساکن کلکتہ کے پاس ہیں۔ لیکن اب وہ سانحۂ کراچی کی وجہ سے ہندوستان نہیں جا سکیں گے۔

اگر حضرت مولانا قاسمی صاحب اپنے اثر و رسوخ سے ان مخطوطات کا کھوج لگا سکیں تو اُمّتِ مسلمہ پر احسانِ عظیم ہوگا۔

ڈاکٹر شیر بہادر خان پنّی
پشاور

ڈاکٹر اسرار احمد

نے اپنی دوسری دینی اور علمی خدمات کیساتھ ساتھ شادی بیاہ کی تقریبات کے ضمن میں

ایک اصلاحی تحریک

بھی برپا کی اور — خُطبۂ نکاح — کو صِرف ایک رسم

کی بجائے واقعی تذکیر و نصیحت اور معاشرتی زندگی سے متعلق اسلامی تعلیمات کو عام کرنے کا ذریعہ بنایا

اس موضوع پر ڈاکٹر صاحب کی ایک اہم تحریر اور ایک خطبۂ نکاح کو دیدہ زیب کتاب کی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے۔

بڑے سائز کے ۴۸ صفحات ○ عمدہ دبیز کاغذ ○ دیدہ زیب کور

ہدیہ : ۴ روپے ——— محصول ڈاک علاوہ

ڈاکٹر محمد رفیع الدین
ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ

منشورِ اسلام

(۲)

نصب العین کی خواہش اور نوعِ انسانی کی ذہنی اور اخلاقی صحت

اگر نصب العین کی خواہش کسی رکاوٹ یا مایوسی سے دوچار ہو جائے تو انسان کی شخصیت دب جاتی ہے اور کمزور ہو جاتی ہے اور انسان پریشان اور غمگین ہو جاتا بلکہ بعض وقت شدید قسم کی ذہنی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس کے برعکس اگر یہ خواہش مسلسل اور مکمل طور پر مطمئن ہو رہی ہو تو انسان کے لیے ترقی پذیر راحت اور مسرّت کا باعث ہوتی ہے۔ ایک انسان کو جس قدر زیادہ اپنے نصب العین سے محبّت ہوتی ہے۔ اسی قدر زیادہ اسکی شخصیّت بھی متحد اور جوان اور صحت مند اور توانا اور بلند اور بالا ہوتی ہے۔ اور اسی قدر زیادہ اس کی زندگی کی مسرّت اور راحت اور طمانیت بھی مکمل اور بھرپور ہوتی ہے۔

تاریخ کا مُدعا

لہٰذا جب سے انسان کو اپنے آپ کا شعور حاصل ہوا ہے انسان ایک ایسے نصبُ العین کی جستجو میں مصروف ہے جس کے سامنے وہ مستقل طور پر اور اپنے دل کی پُوری رغبت کے ساتھ اپنی والہانہ محبّت اور خدمت اور اعانت اور ستائش اور پرستش کے نذرانے پیش کر سکے یعنی ایک ایسا نصب العین جو حُسن اور کمال کے بلند ترین اور دائمی اور ابدی اوصاف سے آراستہ ہو تاکہ اس کی محبّت انحطاط اور زوال اور مایوسی کے حادثات سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ رہے۔

بسا اوقات اس قسم کے نصب العین کی جستجو اُسے شدید مصائب میں مبتلا کر دیتی ہے بھیانک حادثات

کے روبرو کھڑا کر دیتی ہے اور اس سے بڑی بڑی قربانیوں کی یہاں تک کہ جان کی قربانی کی قیمت وصول کرتی ہے تاہم وہ اس جستجو کو ترک نہیں کرتا کیونکہ اس کی فطرت کا ایک زبردست اور بے پناہ تقاضا اسے مجبور کرتا رہتا ہے کہ وہ اسے ہر حالت میں جاری رکھے خواہ اس کے نتائج کچھ ہوں۔ نوع انسانی کی پوری تاریخ (اپنے سارے مرحلوں اور شعبوں سمیت خواہ وہ سیاسی ہیں یا اخلاقی یا قانونی یا علمی یا فنی یا اقتصادی یا فوجی) جس میں جا بجا خوفناک ملک گیر اور عالمگیر جنگوں اور ان گنت انسانوں کی اندوہناک صعوبتوں کے نظارے بھی دکھائی دیتے ہیں فقط ان واقعات کی ایک داستان ہے جو حضرت انسان کو اپنے محبوب نصب العین کی حد درجہ دشوار جستجو کے دوران شروع سے لے کر آج تک پیش آئے ہیں۔

نصب العین کی عمومی صفات

سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان جس نصب العین کی جستجو کر رہا ہے وہ اس کے اندر فی الواقع کون سے اوصاف کی موجودگی کی توقع کرتا ہے اس سوال کا جواب نصب العین کے لیے انسان کی فطری خواہش کی نوعیت کے اندر پہلے ہی سے موجود ہے کیونکہ یہ خواہش حسن کے لیے ہے وہ صرف ایک ایسے نصب العین سے ہی مطمئن ہو سکتی ہے جو منتہائے حسن و کمال ہو یعنی

(۱) جو ہر اس نقص یا عیب سے پاک ہو جس کا ہم انسان ہونے کی حیثیت سے تصور کر سکتے ہیں اور

(۲) جس میں وہ تمام اوصاف بدرجہ کمال موجود ہوں جن کو ہم اپنی فطرت کے تقاضوں کی بنا پر عمدہ اور حسین اور قابل ستائش اور لائق محبت سمجھتے ہیں۔

نقص یا عیب محبت کا دشمن ہے لہٰذا جونہی انسان کو اپنے نصب العین کے اندر کسی چھوٹے سے چھوٹے نقص کی موجودگی کا یا کسی چھوٹی سے چھوٹی خوبی کی عدم موجودگی کا بھی پتہ چلتا ہے اس کی محبت کافور ہو جاتی ہے بلکہ نفرت میں بدل جاتی ہے۔ بے شک ایک انسان ایک زشت ناقص یا گھٹیا نصب العین سے بھی محبت کر سکتا ہے اور کرتا ہے لیکن صرف اس وقت تک جب تک کہ وہ اس کی طرف غلطی سے حسن اور کمال کے وہ تمام اوصاف منسوب کر سکے جن کا وہ تصور کر سکتا ہے اور اپنے آپ کو دھوکہ دے سکے کہ یہ اوصاف درحقیقت اس کے اندر موجود ہیں۔

ایک نصب العین کے خصوصی اوصاف

انسان کے نصب العین کے ان عمومی اوصاف سے ہم بڑی آسانی سے اُس کے نصب العین کے خصوصی اور تفصیلی اوصاف کا استنباط کر سکتے ہیں۔ مثلاً ہم ان عمومی اوصاف کی روشنی میں یہ جان سکتے ہیں کہ :-

(۱) ضروری ہے کہ انسان کے نصب العین کا حُسن غیر محدود اور لازوال ہو کیونکہ اگر اُسے معلوم ہو جائے کہ اس کے نصب العین کے حُسن کی ایک حد ہے جس سے آگے وہ نہیں جا سکتا تو وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو گا کہ اس حد سے آگے اُس کا نقص شروع ہو جاتا ہے اور لہٰذا اس کا ایک حصّہ ناقص ہے۔ پھر اگر اس کو معلوم ہو کہ اس کا حُسن عارضی ہے اور کچھ عرصہ کے بعد ختم ہو جائے گا تو وہ مجبور ہو گا کہ اُسے آج بھی حسن سے محروم سمجھے۔

(۲) ضروری ہے کہ انسان کا نصب العین کوئی ایسی چیز ہو جو زندگی کا وصف رکھتی ہو کیونکہ وہ کسی ایسی چیز کو اپنا محبوب نہیں بنا سکتا جو بے جان اور مُردہ ہو۔ انسان خود زندہ ہے لہٰذا وہ کسی مردہ چیز سے جو مردہ ہونے کی وجہ سے اس سے گھٹیا اور کمتر درجہ کی ہو محبّت نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس کی ستائش کر سکتا ہے اور نہ خدمت کر سکتا ہے اور نہ اعانت۔ انسان کسی مردہ چیز کی ستائش اس وقت کرتا ہے جب وہ اس کی طرف نادانی سے زندگی کا وصف منسوب کر رہا ہو یا شعوری یا غیر شعوری طور پر اُسے کسی زندہ وجود کا مظہر سمجھ رہا ہو۔ ورنہ مردہ چیز کی خدمت اور اعانت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایک تو مردہ چیز کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کوئی اس کی خدمت یا اعانت کر رہا ہے اور دوسرے خدمت یا اعانت کرنے والا اس کی خدمت یا اعانت کا نہ کوئی مفہوم معین کر سکتا ہے اور نہ مقصد۔

(۳) ضروری ہے کہ انسان کے نصب العین کی زندگی اُس کے حُسن کی طرح دائمی ہو کیونکہ اگر اُسے معلوم ہو کہ وہ مستقبل میں کسی وقت مرکر نیست و نابود ہو جائے گا تو وہ یہ محسوس کرنے کے بغیر نہیں رہ سکے گا کہ وہ اب بھی ناپائدار ہے اور اب بھی بالقوہ مردہ ہی ہے اور وہ چھوڑ جانے والا دوست ہے جو قابل اعتماد نہیں۔

(۴) ضروری ہے کہ انسان کے نصب العین کے اندر زندگی کی وہ تمام خصوصیات بدرجہ کمال موجود

ہوں جن کا احساس وہ ایک زندہ وجود کی حیثیت سے اپنی ذات میں کرتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ضروری ہے کہ وہ سن سکے اور دیکھ سکے، سمجھ سکے، محسوس کر سکے، محبّت کر سکے اور محبّت کا جواب محبّت سے دے سکے۔ انسان کی دنیا کے اندر اس کا کوئی مقصود و یا مدعا ہو جسے وہ حاصل کرنا چاہتا ہو اور اس بات کی طاقت رکھتا ہو کہ اس مقصود و یا مدعا کو حاصل کرنے کے لیے عمل کر سکے اور اس عمل میں کامیاب ہو سکے۔ دوسرے لفظوں میں یہ ضروری ہے کہ وہ بعض آرا اور افعال کو پسند کرتا ہو اور بعض کو ناپسند اور اس بات کی قوّت رکھتا ہو کہ وہ جن آرا اور افعال کو پسند کرتا ہے ان کی حوصلہ افزائی اور مدد کر سکے اور جن کو ناپسند کرتا ہے ان کی مخالفت کر سکے اور ان کو تباہ کر سکے۔ اپنے چاہنے والوں اور مددگاروں کو انعام عطا کر سکے اور اپنے دشمنوں اور مخالفوں کو سزا دے سکے۔ مختصر طور پر یہ کہ اُس کے اندر محبّت اور عدم محبّت کے تمام اوصاف موجود ہوں اور وہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اُن کا اظہار کر سکے۔ اگر انسان کے نصب العین کے اندر ان اوصاف میں سے کوئی ایک وصف بھی موجود نہ ہو اور انسان کو اس کا علم ہو جائے تو اس کے لیے اپنے نصب العین سے محبّت کرنا یا اس کی خدمت اور اعانت کے لیے کام کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

محبّت ہمیشہ محبوب کی خدمت کے لیے عمل کا تقاضا کرتی ہے اور یہی عمل اس کی علامت اور اس کا ثبوت ہوتا ہے۔ اس عمل کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ محبوب کو خوش کیا جائے اور اس کی محبّت یا رضامندی یا پسندیدگی یا قرب کے احساس کی مسرّت حاصل کی جائے۔ ایک نصب العین کو چاہنے کے معنی سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوتے کہ نصب العین کے حصُول کے لیے کام کیا جائے یا جد و جہد کی جائے اور اس طرح زیادہ سے زیادہ اس کے قریب پہنچا جائے لیکن اگر انسان کا نصب العین اس قسم کا ہو کہ وہ نہ کسی عمل کو پسند کرتا ہو اور نہ ناپسند، نہ اس کے نزدیک کوئی چیز درست ہو نہ زیبا نہ حق ہو نہ باطل اور نہ نیک ہو نہ بد، دوسرے لفظوں میں انسانی دنیا کے اندر اس کا کوئی مدعا نہ ہو اور کوئی ایسا مقصد نہ ہو جس میں اس کے چاہنے والے اس سے تعاون کر سکیں تو ایسی حالت میں اس کے چاہنے والے کیونکر جان سکتے ہیں کہ اس کی محبّت کا اظہار کرنے کے لیے اور اس کا ثبوت بہم پہنچانے کے لیے اور اُسے خوش کرنے کے لیے اور اس سے قریب ہونے کے لیے ان کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ انسان اپنے نصب العین کی محبّت کا اظہار کرنے کے لیے

کوئی کام کرنا چاہتا ہے اور جاننا چاہتا ہے کہ یہ کام کیا ہے۔ وہ ایسی محبّت سے مطمئن نہیں ہوسکتا۔ جو عمل کی صورت اختیار نہ کرسکے اور دل ہی دل میں رہے اور انسان کے عمل کو اوروں کے لیے چھوڑ دے۔ اگر انسان کو معلوم ہو کہ اس کا نصب العین نہ سن سکتا ہے نہ دیکھ سکتا ہے نہ محسوس کرسکتا ہے نہ جان سکتا ہے نہ سمجھ سکتا ہے نہ محبّت اور عمل اور خدمت اور قربانی کی قدردانی کرسکتا ہے اور نہ محبّت کا جواب محبّت سے دے سکتا ہے تو اس کے چاہنے والوں کے لیے اُن کے خادمانہ افعال اور اعمال کے اندر کوئی کشش باقی نہ رہے گی اور ان کو جاری رکھنے کے لیے کوئی داعیہ موجود نہ رہے گا۔ غور سے دیکھا تو جس چیز کو ایک انسان نیکی سمجھتا ہے وہ انگریزی زبان کی مشہور ضرب المثل کے خلاف کبھی اپنا انعام آپ نہیں ہوتی بلکہ اس کا انعام یہ مسرّت آمیز یقین ہوتا ہے کہ یہ اس کے نصب العین کو جسے وہ ہمیشہ ایک شخص یا شخصیّت تصوّر کرتا ہے پسند آتی ہے۔

(۵) ضروری ہے کہ ایک انسان کا نصب العین صاحب قدرت و قوت ہو کیونکہ اگر اسے معلوم ہو کہ اس کا نصب العین اپنے دوستوں اور مددگاروں کو صلہ دینے یا ان پر نوازش کرنے کی قدرت نہیں رکھتا یا اپنے دشمنوں اور مخالفوں کو سزا دینے سے معذور یا بے بس ہے تو وہ محسوس کرے گا کہ اس سے محبّت کرنا یا اس کی خدمت اور اعانت کرنا ایک بے فائدہ مشغلہ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ دنیا کو اپنے نصب العین کے مطابق لانے کے لیے اڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہوگا اور بڑی بڑی مصیبتیں اٹھا رہا ہوگا تو عین اس وقت اس کے مخالفین نہایت آسانی کے ساتھ اور کسی سزا کے خوف سے بے پروا ہو کر اس کے سارے کام کو بگاڑ رہے ہوں گے اور اس کی ساری کوششوں کو خاک میں ملا رہے ہوں گے اس صورت میں وہ یہ محسوس کرے گا کہ اس کا نصب العین کمزور اور ناتواں ہے اور اس کی محبّت اور پرستش کا حقدار نہیں۔

(۶) ضروری ہے کہ انسان کے نصب العین کے اندر نیکی کے اوصاف بھی بدرجہ کمال موجود ہوں کیونکہ یہ اوصاف بھی حُسن کے اوصاف ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہم ان کو سراہتے اور پسند کرتے ہیں۔ اگر اُسے معلوم ہو کہ اُن اوصاف میں سے کوئی وصف ایسا ہے جو اُس کے نصب العین میں موجود نہیں تو ضروری بات ہے کہ وہ اس کو ایک نقص قرار دے اور جس حد تک کہ اس کا نصب العین اس وصف سے عاری ہو اُسے حسن سے بھی عاری سمجھے اور اس سے محبّت نہ کرسکے۔

(۷) ضروری۔ کہ انسان کا نصب العین اپنے اوصاف میں بے نظیر اور بے مثال ہو اور کوئی ہمسر یا شریک نہ رکھتا ہو اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر وہ سمجھے کہ کوئی اور تصوّر بھی اس کے اوصاف میں شریک ہے تو پھر وہ مجبور ہو گا کہ بیک وقت دو نصب العینوں سے محبّت کرے اور یہ ایک ایسی بات ہے جو اس کی فطرت کی رُو سے ناممکن ہے۔ کسی انسان کے پہلو میں دو دل نہیں ہوتے اور لہٰذا کوئی انسان بیک وقت دو نصب العینوں سے محبّت نہیں کر سکتا اور پھر حسن کی نوعیت ایسی ہے کہ وہ بھی بیک وقت دو نصب العینوں میں اپنی حالت کمال پر موجود نہیں ہو سکتا۔

(۸) ضروری ہے کہ انسان کا نصب العین ایسا ہو کہ پوری کائنات کی تخلیق اس کے مدعا کے مطابق ہو۔ دوسرے لفظوں میں ضروری ہے کہ اس کا نصب العین خود کائنات کا خالق اور حکمران ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر کائنات کے جو قوانین مادّی، حیاتیاتی اور انسانی سطح پر کام کر رہے ہیں چونکہ اس کے اپنے پیدا کیے ہوتے نہ ہوں گے۔ لہٰذا وہ اس کے اور اس کے نصب العین کے مشترک مدعا کے ساتھ متصادم ہوں گے یا پوری طرح سے ہم آہنگ نہ ہوں گے لہٰذا وہ اور اس کا نصب العین دونوں اس قابل نہ ہو سکیں گے کہ اپنے اس مدّعا کو حاصل کر سکیں۔ اس کے علاوہ اگر وہ سمجھے گا کہ کائنات جس میں وہ بھی شامل ہے خود بخود وجود میں آگئی ہے اور خود بخود قائم ہے اور اس پر اور اس کی اپنی ذات پر اس کے نصب العین کا کوئی اختیار یا تصرف نہیں تو وہ سمجھے گا کہ اُس کے نصب العین کی حیثیت اگر اس کی اپنی ذات سے کم نہیں تو اس سے زیادہ بھی نہیں اور لہٰذا وہ اس بات کی ضرورت محسوس نہ کرے گا کہ وہ اس سے محبّت کرے اس کی ستائش کرے یا اس کی خدمت کیلئے جانفشانیاں کرے

انسان کے نصب العین کی محولہ بالا دو عمومی اور بنیادی صفات کے اندر اور بہت سی صفات مضمر ہیں جن کا ہم اسی طرح ان صفات سے استخراج کر سکتے ہیں۔ چونکہ انسان کی فطرت کی رُو سے یہی وہ صفات ہیں جو انسان اپنے نصب العین کے اندر موجود دیکھنا چاہتا ہے۔ لہٰذا خواہ اس کا نصب العین کچھ ہو۔ ایک پتھر ہو یا ایک درخت ہو یا دریا ہو یا پہاڑ یا ایک بُت ہو یا قوم یا نسل یا وطن یا ایک نظریہ یا ازم، وہ ان صفات کو اپنے نصب العین کی طرف ہر حالت میں منسوب کرتا ہے۔ بعض کو شعوری اور دانستہ طور پر اور بعض کو غیر شعوری اور نادانستہ طور پر۔ مثلاً خواہ انسان کا نصب العین کوئی مادی چیز ہو یا کوئی تصوّر، اس کا چاہنے والا اس کے ساتھ اس طرح سے برتاؤ کرتا ہے کہ گویا وہ ایک شخصیّت ہے

جس میں زندگی، قوّت، حُسن، نیکی اور صداقت کے تمام اوصاف پائے جاتے ہیں اور یہی وہ حقیقت ہے جو اس کے لیے ممکن بناتی ہے کہ وہ اس سے محبّت کرے اور اس کی ستائش اور پرستش کرے اور اس کی خدمت کے لیے بڑی بڑی مصیبتیں اُٹھائے۔

نصب العین کی محبّت کا جذبہ اور حقیقتِ کائنات

اب غور فرمائیے کہ ایک طرف سے تو انسان کے اندر ایک ایسے نصب العین کی محبت کا زبردست جذبہ موجود ہے جو خالقِ کائنات ہو اور بدرجہ کمال حُسن، نیکی، صداقت اور قوّت کی صفات کا مالک ہو اور دوسری طرف سے کائنات کی کوئی تشریح اس سے زیادہ قابلِ یقین اور حقائق معلومہ اور مسلّمہ کے مطابق نہیں کہ کائنات کی حقیقت ایک ایسا وجود ہے جس نے اُسے پیدا کیا ہے اور جو بدرجہ کمال حُسن، نیکی، صداقت اور قوّت کی صفات کا مالک ہے اس کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ وہ نصب العین جسے نوعِ انسانی تاریخ کی کٹھن منزلوں میں تلاش کر رہی ہے (یعنی انسان کا صحیح نصب العین) خود حقیقتِ کائنات کے سوائے اور کوئی نہیں۔ یہ ہے وہ ناقابلِ انکار اور عظیم الشان صداقت جسے انبیاء علیہم السلام پیش کرتے ہیں اور جس پر وہ زور دیتے ہیں۔ ہر نبی جو دنیا میں آیا اس کی دعوت کی ابتدا اور انتہا یہ تھی کہ اس نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا: لا اِلٰہ الا اللہ۔ خدا کے سوائے کوئی نہیں جو (اپنی صفات کی بنا پر) تمہاری محبّت، ستائش، پرستش اور خدمت کا حق دار ہو۔

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلّم نے اعلان فرمایا تھا:

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ

اے لوگو اپنے پروردگار کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا ہے اور ان لوگوں کو بھی پیدا کیا تھا جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔

اسلام اور حقیقتِ کائنات کی صفات

قرآن حکیم کی تعلیمات کے مطابق اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ہم خدا کے لیے اللہ کا نام استعمال کریں یا رحمٰن کا یا کوئی اور نام۔ جو بات اہمیّت رکھتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ تمام حسین نام

صرف اُس کے ہیں اور کسی دوسرے کے نہیں۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى

"اُسے اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر۔ خواہ تم اُسے کسی نام سے پکارو (لیکن یاد رکھو کہ) تمام اچھے نام اُسی کے ہیں"

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ

"اور تمام اچھے نام اللہ ہی کے لیے ہیں پس ان ناموں سے اُسے پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے ناموں کے بارہ میں الحاد سے کام لیتے ہیں"

جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کے سو اہم نام گنائے ہیں جو نیچے درج کیے جاتے ہیں:۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ

وہ اللہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

اَلرَّحْمٰنُ	(بہت مہربان)	اَلرَّحِيْمُ	(نہایت رحم والا)
اَلْمَلِكُ	(بادشاہ)	اَلْقُدُّوْسُ	(پاک ذات)
اَلسَّلَامُ	(سلامتی والا)	اَلْمُؤْمِنُ	(امن دینے والا)
اَلْمُهَيْمِنُ	(نگرانی کرنے والا)	اَلْعَزِيْزُ	(غالب)
اَلْجَبَّارُ	(زبردست)	اَلْمُتَكَبِّرُ	(بڑائی والا)
اَلْخَالِقُ	(بنانے والا)	اَلْبَارِئُ	(پیدا کرنے والا)
اَلْمُصَوِّرُ	(صورت بنانے والا)	اَلْغَفَّارُ	(بخشنے والا)
اَلْقَهَّارُ	(دباؤ والا)	اَلْوَهَّابُ	(بہت دینے والا)
اَلرَّزَّاقُ	(روزی دینے والا)	اَلْفَتَّاحُ	(کھولنے والا)
اَلْعَلِيْمُ	(جاننے والا)	اَلْقَابِضُ	(تنگ کرنے والا)
اَلْبَاسِطُ	(کشادہ کرنے والا)	اَلْخَافِضُ	(پست کرنے والا)
اَلرَّافِعُ	(بلند کرنے والا)	اَلْمُعِزُّ	(عزت دینے والا)
اَلْمُذِلُّ	(ذلیل کرنے والا)	اَلسَّمِيْعُ	(سننے والا)

اَلْبَصِیْرُ	(دیکھنے والا)
اَلْعَدْلُ	(انصاف کرنے والا)
اَلْخَبِیْرُ	(خبردار)
اَلْغَفُوْرُ	(بخشنے والا)
اَلْعَظِیْمُ	(عظمت والا)
اَلْکَبِیْرُ	(بڑائی والا)
اَلْمُقِیْتُ	(روزی پہنچانے والا)
اَلْجَلِیْلُ	(بزرگی والا)
اَلرَّقِیْبُ	(نگہبان)
اَلْوَاسِعُ	(کشائش والا)
اَلْوَدُوْدُ	(محبّت کرنے والا)
اَلْبَاعِثُ	(اٹھانے والا)
اَلْحَقُّ	(سچا مالک)
اَلْقَوِیُّ	(زور آور)
اَلْوَلِیُّ	(حمایت کرنے والا)
اَلْمُحْصِیُ	(گننے والا)
اَلْمُعِیْدُ	(دوبارہ پیدا کرنے والا)
اَلْمُمِیْتُ	(مارنے والا)
اَلْقَیُّوْمُ	(سب کا تھامنے والا)
اَلْمَاجِدُ	(عزّت والا)
اَلْاَحَدُ	(بے ہمتا)
اَلْقَادِرُ	(قدرت والا)
اَلْمُقَدِّمُ	(آگے کرنے والا)

اَلْحَکَمُ	(فیصلہ کرنے والا)
اَللَّطِیْفُ	(مہربان)
اَلْحَلِیْمُ	(بردبار)
اَلشَّکُوْرُ	(قدردان)
اَلْعَلِیُّ	(بلندی والا)
اَلْحَفِیْظُ	(حفاظت کرنے والا)
اَلْحَسِیْبُ	(کفایت کرنے والا)
اَلْکَرِیْمُ	(عزّت والا)
اَلْمُجِیْبُ	(قبول کرنے والا)
اَلْحَکِیْمُ	(حکمت والا)
اَلْمَجِیْدُ	(بڑی شان والا)
اَلشَّهِیْدُ	(حاضر)
اَلْوَکِیْلُ	(کام بنانے والا)
اَلْمَتِیْنُ	(قوّت والا)
اَلْحَمِیْدُ	(خوبیوں والا)
اَلْمُبْدِئُ	(پہلی بار پیدا کرنے والا)
اَلْمُحْیِیُ	(جلانے والا)
اَلْحَیُّ	(زندہ)
اَلْوَاجِدُ	(پانے والا)
اَلْوَاحِدُ	(اکیلا)
اَلصَّمَدُ	(بے احتیاج)
اَلْمُقْتَدِرُ	(مقدور والا)
اَلْمُؤَخِّرُ	(پیچھے کرنے والا)

اَلْاَوَّلُ	(سب سے پہلا)	اَلْاٰخِرُ	(سب سے آخر)
اَلظَّاهِرُ	(ظاہر)	اَلْبَاطِنُ	(پوشیدہ)
اَلْوَالِیْ	(مالک)	اَلْمُتَعَالِ	(بلند صفتوں والا)
اَلْبَرُّ	(احسان کرنے والا)	اَلتَّوَّابُ	(توبہ قبول کرنے والا)
اَلْمُنْتَقِمُ	(بدلہ لینے والا)	اَلْعَفُوُّ	(معاف کرنے والا)
اَلرَّءُوْفُ	(نرمی کرنے والا)	اَلْغَنِیُّ	(بے پرواہ)
ذُوالْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ	(عزت و بخشش والا)	اَلرَّبُّ	(پروردگار)
اَلْمُقْسِطُ	(انصاف کرنے والا)	اَلْجَامِعُ	(اکٹھا کرنے والا)
مَالِكُ الْمُلْكِ	(بادشاہی کا مالک)	اَلْمُغْنِیُّ	(بے پرواہ کرنے والا)
اَلْمَانِعُ	(روکنے والا)	اَلضَّارُّ	(نقصان پہنچانے والا)
اَلنَّافِعُ	(نفع پہنچانے والا)	اَلنُّوْرُ	(روشن کرنے والا)
اَلْهَادِیْ	(ہدایت کرنے والا)	اَلْبَدِیْعُ	(نئی طرح پیدا کرنے والا)
اَلْبَاقِیْ	(باقی رہنے والا)	اَلْوَارِثُ	(سب کا وارث)
اَلرَّشِیْدُ	(نیک راہ بتانے والا)	اَلصَّبُوْرُ	(صبر کرنے والا)

نبوّت کی حقیقت

نبی وہ شخص ہوتا ہے جو انسان کے اصلی اور حقیقی نصب العین کا علم خدا کی وحی سے براہِ راست حاصل کرتا ہے اور پھر اپنے اندر اس بات کا ایک زبردست داعیہ محسوس کرتا ہے کہ اس علم کو اپنی تعلیم اور تبلیغ کے ذریعہ سے دوسروں تک پہنچائے۔

انسان کی کوئی قدرتی ضرورت ایسی نہیں ہوتی جس کی تکمیل یا تشفی کے لیے قدرت خود اپنی طرف سے اہتمام نہ کرتی ہو اور پھر قدرت کا یہ اہتمام ایسا نہیں ہوتا کہ انسان اسے ترک کر کے کسی اپنے اہتمام سے اس ضرورت کو پورا کر سکے۔ بلکہ قدرت کا یہ اہتمام اس ضرورت کی صحیح اور پوری تشفی کے لیے ناگزیر ہوتا ہے۔

جس طرح سے قدرت انسان کو اس کی اس کوشش میں کہ وہ اپنی بدنی ضروریات کی تشفی کرے، اس کی اپنی کوشش کے علاوہ بیرونی امداد بھی بہم پہنچاتی ہے اسی طرح وہ انسان کو اس کی اس کوشش میں کہ وہ اپنی نفسیاتی یا روحانی ضروریات کی تشفی کرے، اس کی اپنی کوشش کے علاوہ بیرونی امداد بھی بہم پہنچاتی ہے جس طرح سے قدرت اپنی پیدا کی ہوئی بعض قوتوں مثلاً سورج، بادل، ہوا اور زمین کو بروئے کار لاتی ہے تاکہ انسان ان کی مدد سے غلّہ پیدا کر کے اپنی بھوک کو مطمئن کرے اسی طرح وہ مظہر نبوّت کو کارفرما کرتی ہے تاکہ انسان اُس کی معرفت صحیح نصب العین کا علم حاصل کر کے اپنی آرزوئے حسن کو مطمئن کرے۔

جس طرح انسان خود بخود اور قدرت کی اس مدد کے بغیر جو ممدِ حیات مادی قوتوں کی صورت اختیار کرتی ہے اپنی بھوک کو مطمئن نہیں کر سکتا اسی طرح سے وہ خود بخود اور قدرت کی اُس مدد کے بغیر جو نبوّت کی صورت اختیار کرتی ہے نصب العین کی آرزو کو مطمئن نہیں کر سکتا۔

نبوّت انسان کی ایک ایسی ضرورت ہے جو اُس کے لیے زندگی و موت کی اہمیّت رکھتی ہے

تعلیم نبوّت کی مطلق اہمیّت اس بات سے پیدا ہوتی ہے کہ نصب العین کے لیے انسان کی آرزو نہ دبائی جا سکتی ہے اور نہ روکی جا سکتی ہے۔ جب ایک انسان اپنی حماقت یا بے پرواہی کی وجہ سے نبوّت کی راہ نمائی سے مستفید نہیں ہوتا اور صحیح نصب العین کی محبت سے محروم رہ جاتا ہے تو پھر ایسا نہیں ہوتا کہ نصب العین کے لیے اس کی محبّت کا جذبہ رُک جائے یا دب کر ختم ہو جائے بلکہ وہ ایک غلط نصب العین کی راہ سے اپنا اظہار پانے لگتا ہے اور جب ایک انسان اس طرح ایک غلط نصب العین سے محبّت کرنے لگ جائے تو وہ بعد میں اس خطرناک اور بے بنیاد محبّت کے شدید نقصانات کا سامنا کرنے پر مجبور ہوتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک انسان جو اچھی اور صحت بخش غذا نہ پا سکے اپنی بھوک کو روک نہیں سکتا بلکہ جو غذا بھی اسے مل جائے خواہ وہ کیسی ہی مضر صحت اور خطرناک ہو اسی سے اپنا پیٹ بھرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ لیکن بعد میں اس غذا کے شدید نقصانات کا سامنا کرنے سے بچ نہیں سکتا۔ (جاری ہے)

تبادلۂ خیال

مولانا ابوالکلام آزادؒ کی تفسیر

عمان سے جناب گلزار احمد صاحب کے مکتوب نے زندگی کا وہ عہد یاد دلا دیا جب انگریزی زمانہ حکومت اور اپنی غلامی کے وقت ایسی برگزیدہ، عبقری ہستیاں اس ملک میں پیدا ہوئیں جن کی مثل اب ناپید ہے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ قدرت نے وہ سانچا ہی توڑ دیا جس میں ایسی شخصیتیں ڈھلا کرتی تھیں۔ ان ہی میں سے ایک ہستی مولانا ابوالکلام آزاد کی بھی تھی۔

اُن کی تفسیر کی خوبیاں بیان کرنا، میرے جیسے کم علم کا کام نہیں مولانا قاسمی صاحب مدظلہٗ نے اپنے مختصر مکتوب میں جو کچھ لکھ دیا وہ اس باب میں حرفِ آخر ہے۔

جناب گلزار احمد صاحب نے جس تشنگی کا ذکر کیا۔ اُس کی سیرابی کے لئے جناب ابومومن منصور احمد صاحب نے "الہلال" و "البلاغ" اور دوسری تحریرات مولانا ابوالکلام آزاد سے، بڑی محنت و کاوش سے "ترجمان القرآن" کی تیسری جلد حضرت مولانا محمد عبدہٗ، شیخ التفسیر کی نگرانی میں اُردو اکادمی، اُردو بازار لاہور سے شائع کی ہے اُن کی یہ کوشش صد تعریف کے قابل ہے۔ اس کی قدر و قیمت کے لئے جناب محمد حنیف صاحب ندوی نے جو الفاظ مقدمہ میں لکھے ہیں وہ یہ ہیں:۔

"اگر بارش کی ارزانیوں سے کشتِ فکر شگفتہ و شاداب نہیں ہوتی تو پھوار کیا کم ہے" انہوں نے بالکل صحیح لکھا۔ یہ قابل قدر کتاب ہے۔ لیکن پھر بھی "مولوی مدن کی سی بات کہاں"

یہ معلوم ہے۔ کہ مولانا آزادؒ نے خود "ترجمان القرآن"، جلد ۳، تفسیر "البیان" اور مقدمۂ تفسیر اپنی قلم سے تحریر کر دیا تھا۔ اور "البیان" کا کچھ حصہ چھپ چکا تھا۔ لیکن اُن کی وفات کے بعد ان جواہر پاروں کا پتہ نہ لگ سکا۔ آسمان کھا گیا یا زمین ہضم کر گئی مولانا غلام رسول پاکستان میں مولانا آزاد کے خلیفہ اوّل بھی اس کا پتہ نہ چلا سکے۔ لیکن ایک

(باقی صفحہ پر)

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے زیر اہتمام

ایک نیا تعلیمی منصوبہ

قرآن کالج

- پس منظر
- تعارف
- نصاب اور نظام تدریس
- قواعد وضوابط

پس منظر

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے اغراض و مقاصد

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا قیام ۱۹۷۲ء میں عمل میں آیا تھا۔ اس موقع پر اراکین انجمن نے صدر مؤسس ڈاکٹر اسرار احمد کے تجویز کردہ درج ذیل اغراض و مقاصد پر اتفاق رائے کیا تھا۔

۱۔ عربی زبان کی تعلیم و ترویج۔
۲۔ قرآن مجید کے مطالعے کی عام ترغیب و تشویق۔
۳۔ علوم قرآنی کی عمومی نشر و اشاعت۔
۴۔ ایسے نوجوانوں کی مناسب تعلیم و تربیت جو تعلیم و تعلّم قرآن کو مقصد زندگی بنالیں ــــ اور
۵۔ ایک ایسی قرآن اکیڈمی کا قیام جو قرآن حکیم کے فلسفہ و حکمت کو وقت کی اعلیٰ ترین علمی سطح پر پیش کر سکے

انجمن کی تعلیمی سرگرمیاں

اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کہ گذشتہ ۱۵ سالوں کے دوران انجمن نے اپنے مقاصد میں اطمینان بخش حد تک پیشقدمی کی ہے۔ انجمن کے صدر مؤسس ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ملک گیر سطح پر دروس قرآن اور تقاریر کے ذریعے عوام میں قرآن مجید کے مطالعہ اور اس کے فہم کی عام ترغیب و تشویق کا فریضہ بھی باحسن وجوہ ادا کیا ہے اور مرکزی انجمن خدام القرآن نے قرآن کانفرنسوں، محاضرات قرآنی کے انعقاد اور ڈاکٹر صاحب کی مطبوعات کی اشاعت کے ذریعے علوم قرآنی کی عمومی نشر و اشاعت کا کام بھی

بھرپور طور پر کیا ہے۔ اسی طرح عربی زبان کی تعلیم و ترویج کے ضمن میں مختلف اوقات میں عربی کلاسوں کا اجراء کیا جاتا رہا ہے جن سے کثیر تعداد میں طالبانِ علم نے استفادہ کیا ہے۔

ان سطور میں انجمن کی ان سرگرمیوں کی تفصیل کا بیان کرنا پیشِ نظر نہیں ہے بلکہ مقصود صرف اشارہ دینا ہے۔ البتہ انجمن کے ایک اہم تعلیمی منصوبے قرآن اکیڈمی اور اس کی تعلیمی سرگرمیوں کے بارے میں گفتگو قدرے تفصیل سے ہوگی۔

قرآن اکیڈمی

انجمن کے اغراض و مقاصد کی آخری اور اہم شق ایک ایسی قرآن اکیڈمی کے قیام پر مشتمل ہے جو قرآن مجید کے فلسفہ و حکمت کو وقت کی اعلیٰ ترین علمی سطح پر پیش کر سکے۔ کیونکہ کسی بھی علمی تحریک کی کامیابی کے لئے ایسے ادارے کا وجود ضروری ہے جو اس علمی تحریک کے مقاصد کی آبیاری کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں قرآنی علوم و معارف کو عام کرنے کا جذبہ رکھنے والے افراد نے ایک ایسے ادارے کی ضرورت محسوس کی۔ چنانچہ علامہ اقبال مرحوم کی بھی شدید خواہش تھی کہ ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے جس میں جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ان کی ذہنی سطح کے مطابق قرآن حکیم کے علم و حکمت کا درس دیا جائے۔ اپنے ایک عقیدت مند چودھری نیاز علی مرحوم کے سامنے جب علامہ نے اپنی اس آرزو کا ذکر بار بار کیا تو انہوں نے عرض کیا کہ اس مقصد کے لئے وہ نہ صرف یہ کہ کچھ زمین وقف کرنے کو تیار ہیں بلکہ تعمیر کا سارا بار بھی خود برداشت کریں گے۔ چنانچہ یہی اسکیم تھی جس کے پیشِ نظر مشرقی پنجاب کے ضلع گورداسپور کی تحصیل پٹھانکوٹ میں سرنا ریلوے اسٹیشن سے متصل "دارالسلام" کی تعمیر عمل میں آئی۔ علامہ مرحوم نے ایک خط عالم اسلام کی قدیم و عظیم ترین درسگاہ الازہر کے ریکٹر کو لکھا کہ ہمیں ایک ایسا عالم دین فراہم کیجئے جو جدید فکر سے آگاہ ہو اور جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کو انگریزی زبان میں وقت کی اعلیٰ ترین سطح پر قرآن حکیم کا درس دے سکے۔ لیکن افسوس کہ وہاں سے معذرت موصول ہوگئی کہ ان کے پاس مطلوبہ معیار کا کوئی عالم دین موجود نہیں اور اس طرح اس اسکیم پر عمل کا آغاز نہ ہو پایا

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب، صدر مؤسس، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کو علامہ اقبال مرحوم کے ساتھ جو نسبتِ معنوی حاصل ہے اس کا بیان تحصیل حاصل ہوگا۔ یہاں صرف اس قدر عرض کر دینا مناسب ہے کہ قرآن اکیڈمی کا منصوبہ موصوف نے جون ۱۹۶۷ء میں ماہنامہ میثاق کے ادارتی صفحات میں شائع کیا تھا۔ اور جو ۱۵ سال کی محنت و مشقت اور اللہ کے فضل و کرم سے اب عالمِ واقعہ میں نمودار ہوگیا ہے۔ اس کا نقشۂ کار بعینہٖ وہی ہے جو علامہ اقبال

مرحوم کے پیشِ نظر تھا۔ اور اگر اس کے ذریعے دین کی کوئی بھی چھوٹی بڑی خدمت ہو سکی تو یہ دراصل علامہ مرحوم ہی کا فیضِ معنوی ہوگا۔

بظاہر تو کام بہت بڑا اور مرحلہ سخت مشکل ہے لیکن جس طرح علامہ مرحوم کے ۱۹۳۰ء کے دیکھے ہوئے خواب کی تعبیر ۱۹۴۷ء میں پاکستان کی شکل میں وجود میں آئی۔ یوں لگتا ہے کہ اس خواہش کی تکمیل کے ظہور کا وقت بھی تقویم الٰہی کی رُو سے قریب آگیا ہو۔ ع

شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را

قرآن اکیڈمی کے لئے قطعۂ زمین ایک صاحب خیر نے ماڈل ٹاؤن لاہور میں مرکزی انجمن خدام القرآن کو ہبہ کیا تھا جسے ان کی اجازت سے ڈیڑھ لاکھ روپے میں فروخت کر دیا گیا اور تقریباً ایک لاکھ کے صرف سے ایک دوسرا قطعۂ زمین ماڈل ٹاؤن ہی کے اس حصّہ میں خریدا گیا جو پنجاب یونیورسٹی کے نیو کیمپس سے بہت قریب ہے اور جس پر اب قرآن اکیڈمی کی عمارت تعمیر ہو گئی ہے۔

قرآن اکیڈمی کی تعمیر کے ابتدائی مراحل کے دوران فوری طور پر درج ذیل تعلیمی و تربیتی پروگرام شروع کر دیئے گئے تھے۔

ایک "دارالمقامہ" میں کالج اور یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم طلبا کو رہائش کی سہولت دے کر صبح اور شام کے اوقات میں روزانہ دو گھنٹے عربی کی تعلیم اور قرآن و حدیث سے ابتدائی مناسبت پیدا کرنے کی سعی۔

دوسرے "معہد ثانوی" کے عنوان سے آٹھویں جماعت پاس طلبا کو لے کر دو سال میں میٹرک کی تیاری، عربی اور اسلامیات پر خصوصی زور کے ساتھ۔

لیکن جیسے ہی ضروری تعمیرات کی تکمیل ہو گئی ان عبوری کاموں کا سلسلہ ختم کر کے اکیڈمی کے اصل مقصد کے حصول کے لئے حسب ذیل دو اسکیموں کا آغاز کر دیا گیا۔ ایک ۱۹۸۲ء میں قرآن اکیڈمی کی فیلوشپ یا رفاقت سکیم جس میں سات اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان تعلیم و تعلّم قرآن کے لئے پوری زندگی کو وقف کرنے کے عزم کے ساتھ شریک ہوئے۔ دوسرے ۱۹۸۴ء سے دو سالہ تدریسی کورس کا آغاز کیا گیا۔ اس کا پہلا گروپ اپنی تعلیم مکمل کر چکا ہے۔ اس وقت (جمادی الاوّل ۱۴۰۶ھ) دوسرا گروپ سال دوئم اور تیسرا گروپ سال اوّل میں زیرِ تعلیم ہے۔ اس کورس میں ترجیحاً ایم اے پاس اور کم از کم بی۔ اے پاس طلبہ کو داخلہ دیا جاتا ہے۔ اس

ضمن میں محسوس کیا گیا کہ اچھی خاصی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو اس کورس میں شمولیت کے خواہشمند ہیں لیکن اپنی دفتری اور کاروباری مصروفیات کی بنا پر صبح کا وقت فارغ نہیں کر سکتے۔ اس لئے ایک مختصر کورس کی کلاسیں شام کے اوقات میں منعقد کرنے کا مسئلہ زیرِ غور ہے۔

نیا منصوبہ ۔ قرآن کالج

اب تک کے تجربات کی روشنی میں اندازہ ہوا ہے کہ اگر ایف اے ایف۔ ایس سی پاس طلبہ کو تین سال میں ایک جانب بی اے کے امتحان کی مناسب تیاری کرا دی جائے اور دوسری جانب عربی صرف و نحو کی بنیاد کو پختہ کر کے پورے قرآن مجید کا ترجمہ مع مختصر تفسیر، نیز مطالعہ قرآن حکیم کا وہ منتخب نصاب تفصیلی درس کے انداز میں پڑھایا جائے جو انجمن خدّام القرآن کی تحریک کی اساس بنا ہے اور ساتھ ہی حدیث نبوی کا مختصر انتخاب پڑھا دیا جائے تو انشاء اللہ تعالےٰ اس سے بہت مفید نتائج برآمد ہوں گے۔ اور تحریک رجوع الی القرآن کے مقاصد نہایت عمدگی اور سرعت کے ساتھ حاصل ہوں گے۔

اللہ کا شکر ہے کہ نیو گارڈن ٹاؤن اسکیم میں قرآن کالج کی تعمیر کے لئے ایک تقریباً ساڑھے پانچ کنال کا پلاٹ حاصل کر لیا گیا ہے۔ یہ پلاٹ اتاترک بلاک میں جامع مسجد اور پارک کے عقب میں واقع ہے۔ اس کا نمبر ے ۔ ۱۹۱ ہے۔ اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم سے اس پر تعمیر کا آغاز ہو چکا ہے۔ اس میں کالج کے علاوہ ان شاء اللہ تعالیٰ ایک اعلیٰ سہولتوں والا آڈیٹوریم تعمیر کیا جائے گا۔ جس میں نو سَو افراد کی نشست کا انتظام ہوگا۔ کالج ہوسٹل کی تعمیر بھی انجمن کے پروگرام میں شامل ہے۔

آج سے دس سال قبل انجمن نے قرآن اکیڈمی کی تعمیر کا آغاز بھی اللہ کے بھروسے اور اپنے خلوص و اخلاص کی بنیاد پر کیا تھا اور انہی دو چیزوں کی اساس پر اس منصوبے کا بھی آغاز کر رہے ہیں:

اَلسَّعْیُ مِنَّا وَالْاِتْمَامُ مِنَ اللہِ

قرآن کالج — افتتاحی تقریب و دعا

مؤرخہ ۹ مئی ۱۹۸۶ء کو گارڈن ٹاؤن میں قرآن کالج کے پلاٹ پر ایک تقریب دعا منعقد ہوئی لاہور کی مشہور دینی درسگاہ جامعہ اشرفیہ کے شیخ الحدیث مولانا محمد مالک کاندھلوی مدظلہ العالی اس پر وقار تقریب کے مہمان خصوصی تھے۔ مولانا کے خطاب سے قبل انجمن کے صدر مؤسس ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنے خطاب میں کالج کے قیام کے مقصد کو وضاحت سے بیان فرمایا۔

ڈاکٹر صاحب کا تعارفی خطاب

ڈاکٹر صاحب نے اپنے خطاب کا آغاز سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات سے کیا اور فرمایا کہ قرآن کالج کے قیام کا مقصد سورۃ العلق کی پہلی آیت کے حوالے سے بخوبی سمجھ میں آسکتا ہے: " اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ " یعنی " پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔" مراد یہ ہے کہ کل کا کل علم اللہ تعالےٰ کی معرفت کے ساتھ وابستہ ہے — اللہ تعالےٰ کی معرفت سے بیگانگی انسانی علم کو گمراہی کے راستہ پر ڈال دیتی ہے۔ مولانا رومؒ نے بڑی خوبصورتی سے اس حقیقت کی جانب رہنمائی کی تھی کہ ؎ " علم را بر تن زنی مارے بود! " یعنی ایسی صورت میں یہ علم سانپ بن کر نوعِ انسانی کو ڈستا ہے۔ اس وقت عالمِ انسانیت کا المیہ یہی ہے کہ انسانی علم بے خدا ہو چکا ہے۔ انسان کی تمام تر توجہ مظاہرِ کائنات پر مرتکز ہے لیکن اس کے پس پردہ اصل حقیقت یعنی خالق و مالک کائنات کے وجود کا اثبات و اعتراف سرے سے مفقود ہے۔ بلکہ ذاتِ خداوندی کا ذکر بھی انسانی تحقیق و جستجو کے دائرے ہی سے خارج ہو چکا ہے۔ اقبالؔ نے اس المیئے کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ ؎

عشق کی تیغ جگردار اڑا لی کس نے ۔۔۔ علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی

لہٰذا اس وقت اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ علم کو باخدا بنایا جائے۔ اسی میں نوعِ انسانی کی ھدایت اور فلاح مضمر ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے واضح کیا کہ اس دور میں علم کے دو بڑے شعبے ہیں۔ ایک شعبہ طبعی علوم یعنی PHYSICAL SCIENCES کا ہے اور دوسرا عمرانی علوم یعنی

جہاں تک طبعی علوم کا تعلق ہے، اِن کو اسلام کا SOCIAL SCIENCES کا ۔۔۔ بنانے یا بالفاظِ دیگر باخدا بنانے کے لئے زیادہ محنت کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ اسلامی کیمیا میں پانی کا فارمولا بدل نہیں جائے گا۔ بلکہ پانی بدستور ہائیڈروجن اور آکسیجن کا مجموعہ رہے گا۔ اسی طرح فزکس کے قوانین بھی اپنی جگہ پر رہیں گے۔ فرق صرف یہ ہوگا کہ ایک مسلمان سائنسدان اس بات پر یقین رکھے گا کہ یہ تمام طبعی قوانین (PHYSICAL LAWS) ازخود وجود میں نہیں آ گئے بلکہ ایک ایسی ہستی نے ان قوانین کو بنایا ہے جو علیم و خبیر ہے اور ہر چیز پر قادر ہے۔ چنانچہ وہ جب چاہے ان میں ردّ و بدل کر سکتی ہے۔ اگرچہ اس ہستی یعنی اللہ کا عام دستور یہی ہے کہ وہ ان قوانین میں تبدیلی یا ردّ و بدل نہیں کرتا لیکن بہر حال اس کی قدرت اسے حاصل ہے۔ اسی کی اسی قدرت کا اظہار تھا جب ایک مرتبہ اس کے حکم سے پانی نے اپنی سطح برقرار نہیں رکھی تھی بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے لئے دیوار بن کے کھڑا ہو گیا تھا۔ اسی طرح ایک مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ آگ نے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو نہیں جلایا بلکہ گل و گلزار بن گئی۔ لیکن یہ معجزات دراصل انبیاء اور رسولوں کے ساتھ مخصوص تھے۔ اور اب اگرچہ ختم نبوّت کے ساتھ ہی ان معجزات کا سلسلہ بھی منقطع ہو چکا ہے۔ تاہم نظری طور پر یہ ماننا ضروری ہے کہ ان طبعی قوانین کا خالق و مالک ان قوانین کا پابند نہیں ہے۔ بلکہ وہ جب چاہے کسی قانون کو معطّل کر سکتا ہے۔ باقی جہاں تک ان سائنسی علوم سے حاصل شدہ معلومات اور ان سے اخذ کردہ نتائج کا تعلق ہے، ان میں اصلاً کوئی چیز غلط نہیں ہے۔ صرف اللہ کے تصوّر کو ان کے ساتھ شامل کر دینا بہت کافی ہوگا۔

البتّہ اصل پیچیدگی عمرانی یا معاشرتی علوم میں ہے۔ اس لئے کہ ان علوم میں اللہ کی معرفت اور اس کی ابدی ھدایت یعنی قرآن حکیم سے صرفِ نظر کرتے ہوئے انسان نے جو مختلف نظریات بنا لئے ہیں اور پھر ان کو بنیاد بناتے ہوئے وہ اپنی عملی زندگی کا جو ڈھانچہ بنا رہا ہے اس میں خدا سے دُوری کی وجہ سے بہت کجی آ چکی ہے۔ اس معاملے میں انسان بہت افراط و تفریط کا شکار ہو چکا ہے۔ چنانچہ یہ امر واقعہ ہے کہ ان علوم کو مسلمان بنانے کے لئے بڑی شدید محنت کی ضرورت ہے۔ یہ ایک ایسا ریاضت طلب کام ہے۔ جسے بجا طور پر 'HERCULIAN TASK) قرار دیا جا سکتا ہے[1]۔

---

[1] اس موضوع سے متعلق تفصیلات کے لئے ڈاکٹر صاحب کے کتابچے "اسلام کی نشأۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام" کا مطالعہ کیجئے۔

اس کام کے لئے کثیر تعداد میں ایسے باہمت لوگوں کی ضرورت ہے جنہوں نے ایک طرف جدید علوم کے نظریات کا گہرا مطالعہ اس طور سے کیا ہو کہ ان کے نقطۂ نظر اور طرزِ استدلال کو بھرپور طور پر سمجھ لیا ہو اور دوسری جانب انہیں کتاب و سنّت کے نور سے بہرہ ور ہونے کا بھی پورا موقع ملا ہو۔ گویا اُن کی دونوں آنکھیں روشن ہوں، ۔ پھر اُن میں جو باصلاحیت لوگ ہوں گے۔ یعنی جن میں تخلیقی اور تحقیقی کام کرنے کی صلاحیت ہوگی۔ اُن کے لئے یہ ممکن ہوگا کہ وہ ان جدید علوم پر بھرپور تنقیدی کام کرسکیں یعنی ان کے گمراہ کن اور غلط اجزاء کو الگ کر دیں اور صحیح اجزاء کو چھانٹ کر الگ کر دیں۔ پھر اُن کے لئے یہ بھی ممکن ہوگا کہ وہ ان علوم کے ضمن میں کتاب اللہ اور سنّت رسولؐ کی رہنمائی کو اس دور کی اعلیٰ علمی سطح پر پیش کرسکیں تاکہ بنی نوع انسانی افراط و تفریط سے بچ جائے لیکن یہ اپنی جگہ نہایت محنت طلب کام ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ قرآن کالج دراصل ایسے ہی افراد کی تیاری کے لئے نرسری کا کام دے گا جس میں الف اے، الف ایس سی اور آئی کام پاس طلبہ کو داخلہ دے کر تین سال میں بی اے کی باقاعدہ تعلیم کے ساتھ ساتھ بنیادی دینی تعلیم بھی دی جائے گی۔ (نصاب کی تفصیلات آئندہ صفحات میں مذکور ہیں)۔ اللہ کی رحمت اور تائید شاملِ حال رہی تو ان شاء اللہ انہی طلبہ میں سے ایسے باہمت نوجوان نکل آئیں گے جو اس نوع کا علمی کام کرسکیں گے جس کی آج امّتِ مسلمہ ہی نہیں پوری نوعِ انسانی کو شدید ضرورت ہے۔

مولانا محمد مالک کاندھلوی مدظلہٗ کا خطاب

محترم ڈاکٹر صاحب کے اس تعارفی خطاب کے بعد مہمانِ خصوصی مولانا محمد مالک کاندھلوی مدظلہ العالی نے اپنے خطاب میں بڑے دلنشیں انداز میں قرآن کالج کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی۔ مولانا نے اس منصوبے کی بھرپور تائید کرتے ہوئے فرمایا کہ محترم ڈاکٹر صاحب کی کوششوں سے خدمتِ قرآن کے کام میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو رہا ہے۔

مولانا نے سورۃ البقرۃ کی اس آیت مبارکہ کے حوالے سے، جس میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السّلام کی وہ دعا نقل ہوئی ہے کہ " اے ہمارے رب! بھیج ان میں (یعنی بنی اسماعیل میں) ایک رسول انہی میں سے جو تلاوت کرے اُن پر تیری آیات اور تعلیم دے انہیں کتاب و حکمت کی اور اُن کا تزکیہ کرے " اِس حقیقت کی جانب اشارہ فرمایا کہ اس آیۂ مبارکہ میں چونکہ نبی اکرمؐ کی بعثت کی محض طلب اور دعا ہی نہیں بلکہ مقصدِ بعثت اور

طریقِ دعوت کی وضاحت بھی ہے لہٰذا قرآنی تعلیمات کا جو مرکز بھی قائم کیا جاتا ہے۔ اس کے ذریعے درحقیقت مقاصدِ رسالت کی ترویج اور اشاعت ہی کا کام ہوتا ہے جو بلاشبہ ایک نہایت مبارک کام ہے۔

مولانا نے اپنے خطاب میں مسند امام احمد بن حنبلؒ میں مذکور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ انسانی عقل میں اللہ تعالےٰ نے چار اوصاف پیدا فرمائے ہیں۔ عقل میں کسی چیز کی جانب لپکنے اور سبقت کرنے کا وصف بھی ہے اور کسی چیز سے بدکنے کی صلاحیت بھی۔ اسی طرح اس میں کسی چیز کے لئے رغبت کا مادّہ بھی ہے اور کسی سے نفرت کا رجحان بھی۔ اور عقل انسانی چونکہ انسان کے لئے حاکم اور قوت محرکہ کا جذبہ رکھتی ہے لہٰذا اس کی سربراہی میں انسانی پیکر اپنے اعمال و افعال میں مصروف اور سرگرم رہتا ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کے لئے صحیح راستہ اور رُخ متعیّن کیا جائے اس لئے کہ عقل میں یہ صلاحیت موجود نہیں ہے کہ وہ خیر و شر میں واضح امتیاز کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ عقل اپنے بل پر انسانی زندگی کے لئے صحیح رُخ اور جہت کا تعیّن نہیں کر سکتی۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا قول ہے کہ انسانی عقل ایک بینا آنکھ کی مانند ہے۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ آنکھ کی بینائی اسی وقت کام کرتی ہے جب خارج میں روشنی موجود ہو۔ ایک تاریک کوٹھڑی میں جہاں روشنی کا گزر نہ ہو آنکھ کتنی بھی بینا ہو کام نہیں دے سکتی۔ کچھ یہی معاملہ عقل کا بھی ہے کہ اس کی صلاحیت بھی اسی وقت مؤثر ہوتی ہے جب خارج میں نورِ ھدایت موجود ہو۔ اور خارج کے اس نورِ ھدایت کے لئے اللہ تعالےٰ نے وحی و رسالت کا سلسلہ فرمایا جس نے خیر اور شر کے فرق کو واضح کر دیا اور ہدایت و ضلالت کے امتیاز کو نمایاں کر دیا۔ اس نورِ ہدایت کو کام میں لاتے ہوئے اب عقلِ انسانی یہ تعیّن کر سکتی ہے کہ اُسے پیکرِ انسانی کو لے کر کن راستوں پر چلنا ہے اور کس رُخ پر آگے بڑھنا ہے۔

مولانا نے اپنے خطاب کا اختتام ان الفاظ پر کیا کہ قرآنی علوم درحقیقت انسانی زندگی کے لئے دنیا اور آخرت کی سعادت کا ذریعہ ہیں۔ آخرت کی فلاح تو وحی الٰہی پر موقوف ہے ہی، دنیا میں بھی کوئی انسان فلاح، عافیت اور عزّت کی زندگی وحیٔ الٰہی کی روشنی کے علاوہ کسی اور ذریعے سے نہیں گزار سکتا۔ لہٰذا قرآن کالج کا قیام نہایت مبارک اقدام ہے۔ اللہ تعالےٰ ان کوششوں کو قبول فرمائے اور اس ادارے کو ایمان و ہدایت اور رُشد کا مرکز بنا دے۔

(آمین)

تفصیلات برائے نصاب و نظامِ تدریس

جیسا کہ اس سے قبل ذکر کیا جا چکا ہے۔ قرآن کالج میں ایف اے، ایف ایس سی پاس طلبہ کو داخلہ دیا جائے گا پھر تین سال میں انہیں بی اے کے امتحان کی مناسب تیاری کے ساتھ ساتھ عربی زبان اور بنیادی دینی علوم کی تعلیم بھی دی جائے گی۔ اس سلسلہ میں پیشِ نظر یہ ہے کہ ایک سال میں عربی قواعد (گرامر) کی بھرپور تعلیم دینے کے بعد دوسرے اور تیسرے سال کے دوران بی اے کی تیاری کے ساتھ ساتھ پورے قرآن مجید کا ترجمہ اور حدیث نبوی کا ایک مختصر انتخاب طلبہ کو پڑھا دیا جائے۔ تاکہ دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کی بھی ایک ٹھوس بنیاد بن جائے ـــــ قرآن کالج کے نصاب اور نظامِ تدریس کی تفصیلات حسب ذیل ہیں:

بی اے کا سلیبس

جامعہ پنجاب کے بی اے کے نصاب میں درج ذیل دو مضامین لازمی ہیں

۱۔ انگریزی ـــ (i) پرچہ الف (نظم و نثر) ۱۰۰ نمبر

(ii) پرچہ ب (قواعد و مضمون نگاری) ۱۰۰ نمبر

۲۔ اسلامیات ٦۰ نمبر
مطالعہ پاکستان ۴۰ نمبر } کل ۱۰۰ نمبر

مذکورہ بالا مضامین کے علاوہ جامعہ پنجاب کے سلیبس میں درج شدہ مضامین کی ایک طویل فہرست میں سے کوئی سے دو مضامین منتخب کرنے ہوتے ہیں۔ لیکن قرآن کالج کے طالب علم کا انتخاب محدود ہوگا۔ ہر طالب علم کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ عربی کو بطور انتخابی مضمون (ELECTIVE SUBJECT) اختیار کرے جب کہ دوسرا انتخابی مضمون اسے درج ذیل مضامین میں سے منتخب کرنا ہوگا۔

۱۔ معاشیات (ECONOMICS) ۲۔ سیاسیات

۳۔ عمرانیات (SOCIALOGY) ۴۔ اسلامیات

۵ فلسفہ (PHILOSOPHY) ۶۔ تاریخ

۔ جرنلزم (JOURNALISM) ۸۔ فارسی

نصاب کے مطابق ہر انتخابی (ELECTIVE) مضمون دو دو پرچوں یعنی پرچہ الف اور پرچہ ب پر مشتمل ہوتا ہے اور ہر پرچے کے سو (۱۰۰) نمبر ہوتے ہیں۔

انتخابی مضامین کے علاوہ ہر طالب علم کو ایک اختیاری (OPTIONAL) مضمون بھی لینا ہوگا۔ اس کے لیئے اسے مذکورہ بالا مضامین ہی میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ بشرطیکہ وہ مضمون اس نے انتخابی مضمون (ELECTIVE SUBJECT) کے طور پر منتخب نہ کیا ہو۔ یہ شرط جامعہ پنجاب کے نصاب کے مطابق ہے۔ اختیاری مضمون کا صرف ایک پرچہ ہوگا اور اس کے بھی سو نمبر ہوں گے۔

قرآن کالج کے طلبہ کیلئے اضافی مضامین

جامعہ پنجاب کے مندرجہ بالا نصابی مضامین کے علاوہ قرآن کالج میں درج ذیل اضافی مضامین کی تعلیم بھی دی جائے گی:۔

۱۔ تجوید (یعنی ناظرہ قرآن پڑھنے کا صحیح انداز)

۲۔ عربی:۔ (ا) قواعد (گرامر)

(ii) ' اِقْرَأْ ' (عربی بول چال)

۳۔ ترجمۂ قرآن مجید (مکمل مع مختصر تشریح)

۴۔ تعلیم حدیث

۵۔ قرآن مجید کے اُس 'منتخب نصاب' کی تشریح وتفسیر جو انجمن کے قیام کی بنیاد بنا۔

دورانیہ

صبح آٹھ تا دوپہر ایک بجے کے تعلیمی عرصے میں پینتالیس، پینتالیس منٹ کے چھ

دورانیے (PERIODS) ہوا کریں گے۔ عرصہ تین سال کے دوران مضامین کی تدریسی تقسیم حسبِ ذیل ہوگی۔

سالِ اوّل

۱۔ انگریزی لازمی (پرچہ ب)
۲۔ عربی قواعد (اضافی)
۳۔ تجوید
۴۔ عربی بول چال (اقرأ)
۵۔ منتخب نصاب

سال دوم

۱۔ انگریزی لازمی (پرچہ الف، ب)
۲۔ عربی انتخابی (پرچہ ب)
۳۔ انتخابی مضمون نمبر ۲ (پرچہ ب)
۴۔ ترجمۂ قرآن (اضافی)
۵۔ تعلیم حدیث (")

سالِ سوم

۱۔ انگریزی لازمی (پرچہ الف)
۲۔ اسلامیات و مطالعۂ پاکستان (لازمی)
۳۔ عربی انتخابی (پرچہ الف)
۴۔ انتخابی مضمون نمبر ۲ (پرچہ الف)
۵۔ اختیاری مضمون
۶۔ ترجمہ قرآن / حدیث (اضافی)

- سالِ اوّل میں عربی قواعد کی تدریس دو پیریڈز پر محیط ہوگی، اسی طرح سال دوم میں ترجمۂ قرآن کی تدریس بھی دو دورانیوں (PERIODS) پر محیط ہوگی۔
- لازمی، انتخابی اور اختیاری مضامین کا نصاب جامعہ پنجاب کے نصاب (سلیبس) کے مطابق ہوگا۔ جبکہ اضافی مضامین کا نصاب حسبِ ذیل ہوگا۔

(۱) عربی قواعد (گرامر) قواعدِ عربی کی بھرپور تحصیل کے لئے "عربی کا معلم" (حصہ اوّل تا چہارم) کی تعلیم دی جائے گی۔ تاکہ قواعد پر عبور حاصل کرنے کے بعد مطالعۂ قرآن و حدیث میں سہولت پیدا ہو سکے۔

(۲) عربی بول چال اس سلسلے میں قرآن کالج کے نصاب میں "اِقْرَأ" نامی کتاب کو شامل کیا گیا ہے۔ اس کے مطالعے سے عربی بول چال کی مشق بھی ہوگی اور ساتھ ساتھ قواعدِ عربی کا اجرا بھی ہوگا جس سے قواعد کو پختہ کرنے میں مدد ملے گی۔

(۳) تجوید ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اتنی تجوید ضرور پڑھے کہ جس کی مدد سے وہ قرآن حکیم کو صحیح طور پر پڑھ سکے۔ اور اس پہلو سے ہمارا معاشرہ جس انحطاط سے دوچار ہے اس سے ہم سب بخوبی واقف ہیں۔ اسی "زوالِ علم" کے پیشِ نظر تجوید کو قرآن کالج کے نصاب میں شامل کیا گیا ہے۔ چنانچہ تجوید کے اصولوں اور مخارجِ حروف کی صحیح پہچان کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کے آخری پارے کی چھوٹی سورتیں طلبہ کو حفظ بھی کرائی جائیں گی اور چند پارے ناظرہ بھی بطور مشق پڑھائے جائیں گے تاکہ طلبہ میں صحیح طریقے سے قرآن مجید پڑھنے کی استعداد پیدا ہو سکے۔

(۴) منتخب نصاب انجمن کے صدرِ مؤسس جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے آج سے بیس سال قبل جب دروسِ قرآن کے ذریعے دعوت رجوع الی القرآن کا کام شروع کیا تھا تو اس تحریک کا آغاز قرآن مجید کے بعض منتخب مقامات کے دروس سے کیا تھا۔ پیشِ نظر یہ تھا کہ قرآن مجید سے ایسے مقامات کا انتخاب کیا جائے کہ ان کے مطالعے سے دین کا ایک جامع تصور بھی مسلمانوں کے سامنے آجائے اور یہ بات بھی وضاحت سے معلوم ہو جائے کہ مسلمانوں پر دین کی جانب سے کیا ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید کے بعض مقامات کا انتخاب کیا گیا اور انہیں ایک خاص ترتیب دے کر ایک نصاب مرتب کیا گیا۔ اس نصاب کی افادیت کو خواص و عوام سب نے محسوس کیا اور یہ واقعہ ہے کہ اس نصاب کو مرکزی انجمن خدام القرآن کی تاسیس میں بنیاد کی حیثیت حاصل ہے ـــــ مشہور ٹی وی پروگرام "الھدیٰ" میں ڈاکٹر صاحب نے اسی منتخب نصاب کا سلسلہ وار بیان شروع کیا تھا جو بوجوہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا تھا۔

قرآن کالج کے نصاب میں قرآن حکیم کے اس منتخب نصاب کو ایک اہم مضمون کے طور پر شامل کیا گیا ہے تاکہ فکری سطح پر طلبہ کا براہِ راست تعلق قرآن حکیم کے ساتھ پیدا ہو سکے۔ اس کے دروس طلبہ کو بذریعہ کیسٹ سنوائے جائیں گے اور ان کی سہولت کے لئے ایک معلم بھی کلاس میں موجود ہوں گے۔ تاکہ درس سے متعلق طلبہ کے سوالات کے جوابات بھی ساتھ کے ساتھ دے دیئے جائیں۔

(۵) **ترجمۂ قرآن** سالِ اوّل میں قواعدِ عربی سے واقفیت کے بعد طلبہ ترجمۂ قرآن میں سہولت محسوس کریں گے اور پورے قرآن مجید کے ترجمے کے ذریعے طلبہ قرآن کے متن اور موضوعات سے براہِ راست متعارف ہو سکیں گے۔ اور بلاشبہ یہ ایک بہت بڑی کاوش ہو گی اور اسے قرآن کالج کا امتیاز قرار دیا جا سکتا ہے۔

(۶) **تعلیمِ حدیث** ترجمۂ قرآن کے ساتھ ساتھ حدیث شریف کی ابتدائی تعلیم کو بھی اضافی طور پر قرآن کالج کے نصاب میں شامل کیا گیا ہے تاکہ طلبہ دین کے دونوں بنیادی ماٰخذ یعنی قرآن و حدیث سے متعارف ہو سکیں۔ اس ضمن میں فنِ حدیث کی بنیادی اصطلاحات کی تعلیم کے ساتھ ساتھ "ریاض الصالحین" کا مطالعہ بھی کرایا جائے گا تاکہ مذکورہ مقصد کے حصول کے ساتھ ساتھ طلبہ کے اخلاق و کردار کی اصلاح بھی ہو سکے۔

قرآن کالج ——— ایک نظر میں

قرآن کالج کلیتہً مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر انتظام ہوگا۔ اور انجمن مذکور چونکہ ایک خود مختار ادارہ ہے۔ لہٰذا قرآن کالج کے پنجاب یونیورسٹی سے الحاق کا کوئی امکان نہیں ہے۔ چنانچہ کالج کے طلبہ کا یونیورسٹی میں پرائیویٹ طلبہ کے طور پر رجسٹریشن کرایا جائے گا اور وہ یونیورسٹی کے امتحان میں اسی حیثیت سے شریک ہوں گے۔

واضح رہے کہ اگرچہ یہ کالج اصلاً صرف لڑکوں (Boys) کے لئے ہے۔ تاہم انجمن کے پروگرام میں یہ شامل ہے کہ طالبات کے لئے بھی اسی نوع کا تعلیمی ادارہ قائم کیا جائے۔

طلبہ کا مستقبل قرآن کالج کے فارغ التحصیل طلبہ کیلئے مستقبل میں وہ تمام امکانات کھلے (Open) ہوں گے جو کسی بھی گریجویٹ کے لئے موجود ہوتے ہیں۔ مثلاً اپنے ذاتی کاروبار کے علاوہ وہ اپنے لئے درج ذیل میں سے کسی بھی میدان (Field) کا انتخاب کر سکتے ہیں:

۱ ۔ ایم اے کر کے یا اس کے بعد پی ایچ ڈی کر کے کالج یا یونیورسٹی کی لیکچرر شپ حاصل کر سکتے ہیں۔

۲ ۔ قانون کی ڈگری لے کر قانون سے متعلقہ شعبوں میں ملازمت اختیار کر سکتے ہیں۔

۳ ۔ مقابلے کے امتحان میں کامیابی حاصل کر کے اعلیٰ ملازمتیں حاصل کر سکتے ہیں۔

۴ ۔ بی ایڈ کر کے سیکنڈری سکولوں میں بطور استاد ملازمت حاصل کر سکتے ہیں۔

فارغ التحصیل طلبہ سے تعاون فارغ التحصیل طلبہ سے ان شاء اللہ کالج لاتعلقی اختیار نہیں کرے گا۔ بلکہ انجمن کے وسائل اور حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے جو صورت ممکن ہوگی اُسے طلبہ کے مستقبل کو بہتر بنانے کے لئے بروئے کار لایا

جائے گا۔ فی الوقت درج ذیل اقدامات ہمارے پروگرام میں شامل ہیں جن پر عمل درآمد کی انشاءاللہ بھرپور کوشش کی جائے گی۔

۱۔ صنعتی اور تجارتی خودمختار اداروں اور نیم سرکاری اداروں کو کالج کے تعلیمی اور تربیتی معیار سے مطلع کر کے انہیں ترغیب دی جائے گی کہ وہ ملازمت کے معاملے میں کالج کے طلبہ کو ترجیح دیں۔

۲۔ کالج کے تین سالہ قیام کے دوران اچھی کارکردگی دکھانے والے مستحق طلبہ کو اُن کے آئندہ تعلیمی پروگرام کے سلسلہ میں تعاون فراہم کرنے کی بھرپور کوشش کی جائے گی۔

قواعد وضوابط

۱۔ تعلیمی سال کا آغاز ماہِ شوال سے ہوگا اور اختتام ۲۵ شعبان کو ہوا کرے گا۔

۲۔ کالج کی سالانہ تعطیلات ۲۶ شعبان تا ۵ شوال، برائے رمضان وعید الفطر ہُوا کریں گی۔

۳۔ جمعہ کے دن ہفتہ وار تعطیل کے علاوہ پورے تعلیمی سال میں صرف عرفہ اور عید الاضحیٰ کے لئے ۸ تا ۱۲ ذوالحجہ تعطیل ہوا کرے گی۔

۴۔ تدریس کے اوقات صبح ۸ بجے تا ایک بجے دوپہر ہوں گے جن میں موسم کے مطابق کسی قدر ردّوبدل کیا جاسکے گا۔

۵۔ قوم کی مجموعی اخلاقی حالت اور پابندی و تسلسل سے کام کرنے کی عادت کے فقدان کے پیشِ نظر تاخیر سے آنے اور اسباق سے غیر حاضری پر جرمانے عائد کئے جائیں گے اور ہر سبق (پیریڈ) میں حاضری لی جائے گی۔

۶۔ دیر سے آنے کا جرمانہ ایک روپیہ اور کسی سبق سے غیر حاضری پر دو روپے جُرمانہ ہوگا۔ پورے دن کی بغیر اجازت غیر حاضری پر ۱۰ روپے جرمانہ کیا جائے گا۔ جرمانے کی رقم ماہانہ وصول کی جائے گی۔ (دارالمقامہ میں مقیم طلبہ کی رات کے وقت ہاسٹل سے بلا اجازت غیر حاضری کا جُرمانہ اس کے علاوہ ہوگا)

۷ ۔ واقعی علالت یا شدید مجبوری کی صورت میں غیر حاضری کی بلا جرمانہ اجازت دی جا سکے گی۔ بشرطیکہ :۔

(الف) والدین یا سرپرست کی تحریری درخواست پر اور ہاسٹل میں مقیم طلبہ کی اپنی درخواست پر انجمن کے ناظم اعلیٰ سے پیشگی اجازت حاصل کر لی گئی ہو۔

(ب) پیشگی اجازت حاصل کرنا اگر واقعتہً ممکن نہ ہو تو والدین یا سرپرست کی تحریری درخواست پر بعد میں ناظم اعلیٰ سے منظوری حاصل کر لی گئی ہو۔

۸ ۔ اگر انجمن نے محسوس کیا کہ کوئی طالب علم :

(الف) کلاس کے ساتھ چل نہیں پا رہا یا

(ب) اس میں مناسب استعداد موجود نہیں ہے یا

(ج) وہ محض وقت گزاری کے لئے کلاس میں شامل ہوا ہے یا

(د) وہ نظم و ضبط کی پابندی نہیں کر رہا یا

(ہ) اس کا کردار اور چال چلن غیر مناسب اور انجمن کے حق میں نقصان دہ ہے تو مناسب انتباہ کے بعد ایسے طالب علم کا کالج سے اخراج عمل میں آجائے گا۔ ایسی صورت میں اس کا زرِ ضمانت اور ادا شدہ فیس بحق انجمن ضبط ہو جائے گی۔ اس ضمن میں انجمن کے صدر کا فیصلہ قطعی اور حتمی ہوگا اور اس کے خلاف کہیں اپیل نہیں کی جا سکے گی۔

۹ ۔ جو طلبہ انجمن کے دارالمقامہ (ہاسٹل) میں اقامت گزیں اور اس کے دارالطعام سے مستفید ہونا چاہیں گے انہیں ہر دو کے قواعد و ضوابط کی پوری پابندی کرنی ہوگی نظم کے اعتبار سے دارالمقامہ اور دارالطعام دونوں انجمن کے ناظم اعلےٰ کے زیرِ انتظام ہوں گے۔

۱۰ ۔ قرآن کالج، دارالمقامہ اور دارالطعام کے قواعد و ضوابط میں پیشگی اطلاع کے بغیر ترمیم اور تبدیلی کا پورا حق انجمن کے ناظم اعلیٰ کو حاصل ہوگا۔

۱۱ ۔ دارالمقامہ میں مقیم طلبہ کے لئے پنجگانہ باجماعت نماز کی پابندی ضروری ہوگی۔

امتحانات اور ترقی

- قرآن کالج میں سالانہ اور ششماہی امتحانات کے علاوہ ماہانہ ٹیسٹ بھی ہوں گے
- کسی امتحان یا ٹسٹ کے کسی پرچے میں غیر حاضری کی صورت میں اگرچہ طالب علم کی رزلٹ شیٹ میں اسے 'غیر حاضر' شمار کیا جائے گا لیکن مجموعی حاصل کردہ نمبروں کا اوسط نکالتے وقت غیر حاضری کو 'صفر نمبر' تصور کیا جائے گا۔ جس سے اس کا مجموعہ نتیجہ اثر انداز ہوگا۔
- دونوں بڑے امتحانات اور تمام ماہانہ ٹیسٹوں میں ہر طالب علم کے لئے مجموعی طور پر ۵۰ فیصد نمبر حاصل کرنا ضروری ہوگا۔ بصورتِ دیگر طالب علم کو اگلی کلاس میں ترقی نہیں دی جائے گی۔

داخلہ

- مناسب تشہیر کے ذریعے داخلہ کا نوٹس ان شاءاللہ جمادی الاُخریٰ کے آخری عشرے میں دے دیا جائے گا۔
- داخلے کی درخواستیں وصول کرنے کی آخری تاریخ ۲۵ رجب ہوگی۔
- داخلے کے لئے انٹرویو یا ٹسٹ شعبان کے دوسرے عشرے میں ہوں گے
- داخلہ منظور ہونے کی صورت میں کالج کے واجبات ادا کرنے کی آخری تاریخ ۲۵ شعبان ہوگی۔
- اوائل شوّال سے کلاسوں کا باقاعدہ آغاز ہوگا۔ دارالمقامہ میں اقامت حاصل کرنے والے طلبہ کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ کلاسوں کے باضابطہ اجراء سے قبل دارالمقامہ پہنچ جائیں۔

فیس

- داخلہ کے وقت طلبہ کو درج ذیل فیس یکمشت جمع کرانی ہوگی جس کی آخری تاریخ ۲۵ شعبان ہوگی۔

(ا) زرِ ضمانت (قابل واپسی) ۱۰۰/- روپے
(ب) داخلہ فیس (تین سال میں ایک مرتبہ) ۱۰۰/- روپے
(ج) تعلیمی فیس (شوال تا ربیع الاوّل) چھ ماہ ۶۰۰/- روپے
کل رقم ۸۰۰/- روپے

- دیگر چھ ماہ یعنی ربیع الثانی تا رمضان المبارک کی تعلیمی فیس مبلغ چھ صد روپے جمع کرانے کی آخری تاریخ ۲۵ ربیع الثانی ہوگی۔

فیس میں رعایت

- محدود تعداد میں طلبہ کے لئے فیس میں رعایت کا امکان ہوگا جس کی درج ذیل صورتیں ہوں گی:

(الف) فیس بالاقساط وصول کی جاسکتی ہے یعنی ۸۰۰/- روپے کی رقم متعدد قسطوں میں ادا کی جائے۔

(ب) تعلیمی فیس میں نصف کی رعایت دے کر ۵۰ روپے ماہوار کے حساب سے وصول کی جاسکتی ہے۔

(ج) تعلیمی فیس کلیتہً معاف کی جاسکتی ہے۔ (طالب علم کے معاشی حالات کے پیش نظر)

- فیس میں کسی قسم کی رعایت کا فیصلہ طلبہ کی گذشتہ تعلیمی کارکردگی اور اس کے والد/سرپرست کی معاشی حالت کی مشترکہ بنیاد پر ہوگا۔ رعایت دینے یا نہ دینے کا فیصلہ کرنے کے مجاز انجمن کے ناظم اعلیٰ ہوں گے۔

ذہین طلبہ کے لئے وظائف کا امکان

جو طلبہ انٹر کے نتائج کی بنیاد پر کسی وظیفے کا استحقاق رکھتے ہوں لیکن قرآن کالج میں داخلہ کی وجہ سے اس سے محرومی کا اندیشہ ہو یا دیگر غیر معمولی ذہانت و صلاحیت کے حامل طلبہ کی جانب سے درخواست موصول ہونے پر انجمن اُن کے لئے مناسب وظائف کے معاملے پر ہمدردی

کے ساتھ غور کرے گی۔ واضح رہے کہ یہ وظائف محض کسی امتحان کے نتائج کو مدِنظر رکھ کر ہی دیئے جائیں گے۔

- مزید براں ایسے ذہین اور باصلاحیت طالب علم جس کے لئے گھر یلو مالی حالات سے میٹرک یا ایف اے کے بعد تعلیم کو جاری رکھنا ممکن نہ ہو انجمن اُن کو بھی وظائف دینے پر غور کر سکتی ہے۔

دارالمقامہ (ہاسٹل)

- انجمن کے دارالمقامہ (ہاسٹل) میں محدود تعداد میں طلبہ کی رہائش اور خوراک کا انتظام ممکن ہوگا۔
- اگر دارالمقامہ میں رہائش کے خواہشمند طلبہ کی تعداد گنجائش سے زیادہ ہوگی تو اُن کے درمیان ترجیحی فیصلہ اُن کی گذشتہ تعلیمی کارکردگی یا داخلہ ٹسٹ / انٹرویو کی بنیاد پر ہوگا۔
- دارالمقامہ میں فی الوقت رہائش (جس میں گیس، پانی اور بجلی وغیرہ کے اخراجات شامل ہوں گے) کا مجموعی کرایہ -/۱۰۰ روپے ماہوار اور خوراک کا خرچ ۱۵۰ روپے ماہوار ہے۔ یعنی کل خرچ -/۲۵۰ روپے ماہوار ہے۔

غیر نصابی سرگرمیاں

مناسب وقفوں کے ساتھ کالج میں مضمون نویسی اور تقریری مقابلوں کا انعقاد کیا جائے گا اور اچھی کارکردگی پر انعامات دیئے جائیں گے۔

ہاسٹل کے طلبہ کے لئے صبح کی ورزش ضروری ہوگی۔

ہوم ورک کی سہولت

مغرب اور عشاء کے درمیان کالج میں طلبہ کو ایک کلاس روم بمع ایک استاد مہیّا کیا جائے گا تاکہ طلبہ وہاں سکون اور دل جمعی کے ساتھ اپنا ہوم ورک مکمّل کر سکیں اور بوقتِ ضرورت استاد سے رہنمائی بھی حاصل کر سکیں۔

مقابل ہے آئینہ

کراچی کی آگ کو بھڑکانے میں کس کس کا — کتنا کتنا حصہ ہے؟

سقوطِ مشرقی پاکستان کے پندرہ برس بعد — سندھ کیوں جل رہا ہے؟

پنجابی سندھی کشمکش — مہاجر پٹھان تصادم کیوں بن گئی ؟

کیا اس شر میں کچھ خیر بھی ہے؟

سیاسی محرومیوں انتظامی بے تدبیریوں حکمرانوں کے آمرانہ طرزِ عمل اپنوں کی مہربانیوں اور غیروں کی سازشوں کا — بے لاگ تجزیہ

اصلاحِ احوال کی مثبت تجاویز

امیر تنظیم اسلامی **ڈاکٹر اسرار احمد** کا تازہ سلسلہ مضامین

استحکامِ پاکستان اور مسئلہ سندھ

کتابی صورت میں دستیاب ہے

MARCH 1987 Regd No. L. No. 8193

MONTHLY
HIKMAT_E_QURAN
LAHORE

VOL. 6
NO. 3

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیرِ اہتمام

ایک نئی تعلیمی سکیم: قرآن کالج

اعلان داخلہ برائے بی اے کلاس

الحمدللہ کہ اِس سال سے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیرِ اہتمام قرآن کالج کے نام سے ایک نئی تعلیمی اسکیم کا باضابطہ آغاز ہو رہا ہے۔ اِس اسکیم کے تحت ایف۔ اے، ایف۔ ایس سی پاس طلبہ کو داخلہ دیا جائے گا۔ اور تین سال کے عرصے میں جامعہ پنجاب کے نصاب کے مطابق بی۔ اے کے امتحان کی باقاعدہ مناسب تیاری کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کے ایک بنیادی نصاب کی تعلیم بھی دی جاتے گی۔ جس میں عربی زبان کی مضبوط بنیادوں پر تحصیل، پورے قرآن مجید کا ترجمہ اور تعلیم حدیث کے پروگرام خصوصیت کے ساتھ شامل ہوں گے۔ چنانچہ اِس سلسلے میں:

1. ایف اے، ایف ایس سی اور آئی کام پاس طلبہ سے درخواستیں مطلوب ہیں۔ جو طلبہ نتیجہ کے منتظر ہوں وہ بھی درخواست دے سکتے ہیں۔
2. داخلہ کے لیے درخواستیں وصول کرنے کی آخری تاریخ ۲۶ مارچ ۸۷ء ہے جبکہ داخلہ ٹیسٹ یا انٹرویو ان شاء اللہ اپریل کے مہینے میں ہوگا جس کی معیّنہ تاریخ سے درخواست دہندگان کو مطلع کر دیا جائے گا۔
3. تعلیم کا آغاز ان شاء اللہ ماہِ رمضان المبارک کے فوراً بعد یعنی اوائل جون میں ہوگا۔
4. بیرونِ لاہور کے طلبہ کے لیے ہاسٹل کی سہولت موجود ہے۔

نوٹ: کالج پراسپکٹس اور داخلہ فارم حاصل کرنے کیلئے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے نام دس روپے کا پوسٹل آرڈر یا ڈاک ٹکٹ روانہ کریں

المعلن: قمر سعید قریشی، ناظمِ اعلیٰ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن
فون ۸۵۲۶۸۳